باقیاتِ غالب
وجاہت علی سندیلوی

وجاہت علی سندیلوی

قیمت مجلّد
تین روپیہ

ناشر
نسیم بک ڈپو ــــ لاٹوش روڈ لکھنؤ
ٹیلیفون ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۲۴۵۵۹

ناشر: عزیز الرحمن (بار دوم اپریل سنہ ۶۹ء) پرنٹر نامی پریس لکھنؤ

اے دل از گلبنِ اُمید نشانے بہ من آر
نیست گر تازہ گلے برگِ خزانے بہ من آر

نذرِ عقیدت

اپنے والد ماجد جناب چودھری عشرت علی صاحب مرحوم
کے نام

وجاہت علی سندیلوی
عشرت منزل — سندیلہ

غالب کے متداول دیوان سے باہر اس وقت تک غالب کا جس قدر بھی کلام نسخۂ حمیدیہ یا دیگر ذرائع سے منظرِ عام پر آیا ہے، اس کا مختصر اور جامع اِنتخاب مع تنقیدی مضامین و مطالب اشعار ——

اختلاطِ شبنم و خورشید تاباں دیدہ ام
جرأتے باید کہ عرضِ شوقِ دیدارش کنم

Scanned with CamScanner

ترتیب

MONOG.
GOVT OF
INDIA

VICE PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

No VP(U)3109

مورخہ ۲۹ ستمبر ۶۳ء

مکرمی وجاہت علی صاحب۔ السّلام علیکم
نوازش نامہ مورخہ ۱۰ ستمبر بھی وقت پر
مل گیا تھا اور آپ کی بھیجی ہوئی دونوں کتابیں
"باقیات غالب" اور "بے ساختہ اور بے ضابطہ"
بھی۔ دلی شکریہ قبول فرمائیں۔
پہلی کتاب باقیات غالب میں نے پڑھ لی
ہے۔ بہت خوب ہے۔ میں نے اس سے بہت کچھ سیکھا۔
دوسری کتاب ابھی نہیں پڑھ پایا ہوں۔
خدا کرے آپ بخیر ہوں اور آپ کی تحریروں
سے اُردو ادب مالامال ہوتا رہے۔

مخلص
ذاکر حسین

پیشِ لفظ

گل غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے
اے آگہی فریب تماشا کہاں نہیں؟

مرزا غالب کی زندگی میں ان کے منتخب اردو دیوان کے کچھ اڈیشن شائع ہوئے تھے۔ ان میں اشعار کی تعداد مختلف، لیکن زیادہ سے زیادہ ۱۸۰۲ تھی۔ غالب کے عام متداول دیوان بنیادی طور سے انھیں ۱۸۰۲ اشعار پر مشتمل ہیں۔ البتہ بعض ناشرین نے کچھ مشہور اور متفرق اشعار کا اضافہ بھی کرلیا ہے۔

غالب کی زندگی میں ان کا کچھ ایسا کلام شائع بھی ہو چکا تھا کہ جس کو بعد میں انھوں نے دیوان میں شامل نہیں کیا تھا مثلاً کچھ کلام دہلی کے اخبارات میں شائع ہوا تھا بالخصوص شہزادہ جواں بخت کا سہرا اور شاہ ظفر کی ایک غزل پر مخمس یا کچھ متفرق تاریخیں قطعات یا اشعار جو اس زمانے کے بعض مصنفین کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں، متداول کلام میں نہیں ہیں۔

سنہ ۱۸۶۹ء میں غالب کی وفات ہوئی۔ اس کے بعد مختلف ذرائع سے رفتہ رفتہ اور جستہ جستہ ان کا وہ کلام شائع ہونے لگا جو ان کی زندگی میں شایع نہیں ہوا تھا مثلاً کچھ متفرق کلام ان کے خطوط سے دستیاب ہوا کچھ ان کے دوستوں قدردانوں اور ہم عصروں کی بیاضوں اور یادداشتوں

کے توسل سے منظر عام پر آیا۔ پچاس پچپن شعر گل رعنا کے نسخے سے ملے۔ اس نسخے کو غالب نے ۱۸۲۹ء میں مرتب کیا تھا اور یہ ان کے فارسی اور اردو کلام کا مختصر انتخاب تھا۔ یہ سب کلام مجموعی طور سے کچھ ایسا زیادہ نہ تھا اور گل رعنا کے اشعار کو چھوڑ کر اس کا بیشتر حصہ غالب کے سب سے آخری دور شاعری کی یادگار تھا

لیکن جب ۱۹۲۱ء میں مفتی انوار الحق صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال نے نسخہ حمیدیہ شایع کیا تو بیک وقت غالب کے غیر مطبوعہ کلام کا ایک اتنا بڑا مجموعہ عالم شہود میں آ گیا کہ جو ضخامت میں ان کے متداول دیوان کے تقریب قریب برابر ہی تھا۔ اس نسخے کی ابتدائی کتابت نومبر ۱۸۲۱ء میں کی گئی تھی۔ اس وقت غالب کی عمر جو ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء میں پیدا ہوئے تھے صرف چوبیس سال تھی۔ ان کے ایسے عظیم المرتبت شاعر کی کاوش فکر کے یہ ابتدائی نقوش یقیناً ان کے بے شمار قدر دانوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ اور تحفہ بے بہا اور خود اردو شاعری کے لیے ایک نادر دفینے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۱۹۳۰ء میں عبدالباری آسی صاحب نے غالب کے نام سے چند غزلیں شایع کرائی تھیں۔ یہ غزلیں بقول ان کے انھیں ایک پرانی بیاض میں غالب کے نام سے ملی تھیں۔ ان کی شان نزول کی مفصل کیفیت کے متعلق مکمل شرح دیوان غالب میں آسی صاحب کا مقدمہ ملاحظہ طلب ہے۔ لیکن بعد کی تحقیقات سے یہ بات قطعی طور سے ثابت ہو چکی ہے کہ یہ کلام غالب کا نہیں بلکہ خود آسی صاحب کا تھا اسی طرح بعض دیگر حضرات نے بھی غالب کے نام سے چند غزلیں یا اشعار منسوب کیے لیکن ان کا یہ جعل فوراً یا کچھ عرصے بعد کھل گیا۔

متداول دیوان سے باہر جب غالب کا اتنا بہت سا کلام جمع ہو گیا تو سب سے بڑا سوال اس کی باقاعدہ شیرازہ بندی مناسب تدوین اور تاریخی

ترتیب کا پیدا ہوا۔ مختلف حضرات نے اس سلسلے میں مختلف کوششیں کی ہیں۔ اس سلسلے کی تازہ ترین اور مقابلتاً کامیاب ترین کوشش دیوان غالب اردو نسخہ عرشی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ غالب کے اردو کلام کا اس سے جامع اور اس سے بہتر ترتیب کا مجموعہ اب تک شایع نہیں ہوا۔ فاضل مرتب نے اس سلسلے میں جو عرق ریزی اور محققانہ تلاش و جستجو کی ہے اس کا اندازہ صرف اس کے مطالعے سے ہو سکتا ہے۔ اس نسخے نے اردو ادب کی ایک بہت بڑی کمی کو پورا کر کے اپنے مرتب امتیاز علی صاحب عرشی کا نام اس کے محسنوں کی فہرست میں ثبت کر دیا ہے غالب کے کلام کے متعلق جو تحقیق اور تجسس مالک رام صاحب نے کیا ہے اور جس سخن سنجی اور جگر کا وی سے اسے پرکھا اور اصل کو نقل سے جدا کیا ہے اور غالب کی زندگی کے بیشتر حصوں کو جس منکرانہ انداز سے اجاگر کیا ہے وہ بھی داد سے مستغنی ہے۔ اردو ادب پر ان کے بڑے احسانات ہیں۔

غالبؔ کے اردو کلام کے مکمل مجموعے کی جو تاریخی اہمیت اور ادبی افادیت ہے یا غالبیات کے محققین۔ قدر دانوں اور طالب علموں کے لیے وہ جس قدر ضروری کارآمد اور بصیرت افروز ہو سکتا ہے وہ محتاج بیان نہیں اس کی اپنی جگہ مستحکم اور مسلم ہے۔ نسخہ حمیدیہ کا بیشتر حصہ غالب کی "بیدلانہ" شاعری پر مشتمل ہے اور بڑی حد تک مشکل، مغلق اور مضامین خیالی سے پر ہے اس سے صحیح طور پر لطف اندوز ہونا صرف ہمت دشوار پسند، ہی کا کام ہو سکتا ہے۔ عام شائقین کے لیے وہ پیاسے کی گردن کا گھڑا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس کے ایک مختصر انتخاب کو پیش کرنے کی کوشش غالباً ایک سعی لاحاصل نہیں سمجھی جا سکتی۔

کہا جا سکتا ہے کہ جب انحصار ہی پر زور ہے تو غالب کے متداول کلام سے ان کا غیر متداول کلام بالکل ہی علٰحدہ کیوں نہ رکھا جائے لیکن یہ بھی درست نہ ہوگا۔ غیر متداول کلام کے بعض شہ پاروں کو نظر انداز کر دینا صرف غلطی نہیں بلکہ ظلم ہوگا غالب کا وہ کلام جو ان کے منتخب دیوان میں پایا جاتا ہے دیوان سے باہر کے کلام سے بحیثیت مجموعی لطافت بیان تازگی فکر اور نزاکت خیال میں بہت زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے لیکن اس سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ دیوان سے باہر بھی ان کے دو چار یا دس بیس نہیں بلکہ سیکڑوں ایسے اشعار ملتے ہیں جو ان کے دیوان کے سیکڑوں اشعار سے بڑھ چڑھ کر ہیں اور ان میں کافی تعداد ایسے اشعار کی بھی ہے جن کو دیوان کے بعض انتہائی لطیف اور بلیغ اشعار کی صف میں جگہ دی جا سکتی ہے۔

مولانا حالؔی نے دیوان غالب کے متعلق فرمایا تھا کہ غالب کے دیوان میں کچھ اشعار رہ گیے ہیں کہ اگر نکل جاتے تو بہت اچھا ہوتا اور اگر یہ رائے بعد از وقت نہ ہوتی اور غالب کو اس پر عمل کرنے کا موقع مل جاتا تو غالب کا دیوان بے مثل اور بے نظیر ہوتا۔ حالؔی کا یہ مشورہ واقعی بہت پرخلوص اور مناسب تھا۔ معیار انتخاب اگر کچھ اور سخت اور بلند کر دیا جاتا تو یقیناً وہ رنگ پر سہاگے کا کام دیتا لیکن چونکہ حالؔی کے سامنے غالبؔ کا وہ کلام موجود نہ تھا جو ان کی وفات کے بعد شایع ہوا لہٰذا ان کا مشورہ صرف نصف صداقت کا حامل ہے۔ غالب کا دیوان اب بھی بے مثل اور نظیر ہے لیکن اگر اس کے کچھ اشعار نکال دیئے جاتے اور ساتھ ہی اس میں شامل نہ کیے جانے والے کچھ تلم زدہ یا گم شدہ اشعار اس میں شامل کر دیئے جاتے تو اس کی معنی آفرینیاں۔ نفسیاتی موشگافیاں اور تخیل کی بھرپور اور بے باک جلوہ

سامانیاں اختصار کے ساتھ مجتمع ہو کر یقیناً نہیں معلوم کہاں سے کہاں پہونچ جاتیں۔

غالب کے منتخب دیوان سے باہر اس وقت تک ان کا جس قدر بھی غیر متداول کلام منظر عام پر آیا ہے میں نے اس کو سامنے رکھ کر ایک مختصر انتخاب کر دیا ہے۔ اس کو زیادہ مفید بنانے کے لیے میں نے آخر میں بعض مشکل اشعار کے مطالب بھی درج کر دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں میری یہ کوشش اپنی نوعیت کی پہلی کوشش نہیں ہے ۱۹۳۱ء میں مولوی عبدالباری صاحب آسی نے مکمل شرح کلام غالب یعنی غالب کے غیر مطبوعہ کلام کی مفصل اور مکمل شرح تصنیف کی تھی لیکن اس میں آسی صاحب نے صرف نسخۂ حمیدیہ اور ایک خود ساختہ بیاض کو پیش نظر رکھا تھا۔ غالب کے دوسرے غیر متداول کلام کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اور اس وقت تک اس کا بہت سا حصہ طبع بھی نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ جیسا کہ آسی صاحب نے اپنے مقدمے میں خود لکھا ہے انہوں نے اپنے انتخاب سے صرف وہ اشعار نکال دیئے تھے جو ان کی رائے میں مشکل اور پیچیدہ تھے یا جن سے کوئی خاص مطلب سمجھ میں نہ آتا تھا۔ باقی کے لئے انھوں نے کوئی معیاری پابندی نہیں لگائی تھی —— چنانچہ ان کا انتخاب خود اتنا ضخیم ہو گیا ہے کہ اب اس کے انتخاب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کچھ غزلیں غالباً سہواً ابھی چھوٹ گئی ہیں اور کچھ غزلیں آسی صاحب کے انتخاب میں ایسی بھی شامل ہو گئی ہیں جو بالتحقیق غالب کی نہیں ہیں مثلاً ؎

یا مجھے شبنم گریاں ہی بنایا ہوتا!
ورنہ یارب، گل خنداں ہی بنایا ہوتا

یہ غزل معروف کی ہے۔ اسی طرح ؎

بتائیں ہم تمھارے عارض و کاکل کو کیا سمجھے
اسے ہم سانپ سمجھے اور اسے من سانپ کا سمجھے

یہ غزل حافظ عبدالرحیم حقیر عظیم آبادی کی ہے۔ اسی طرح آسی صاحب نے بیاض شاکر کی آڑ لے کر غالب کے نام سے اپنی غزلیں شامل کر دی ہیں جس کی وجہ سے اس انتخاب کی ساکھ اور بھی کم ہو گئی ہے۔

اشعار کے مطالب لکھنے میں چند مقامات پر میں نے آسی صاحب کی شرح سے مدد لی ہے لیکن بیشتر مقامات پر میں نے اپنا زاویہ نگاہ ان سے مختلف پایا ہے اور اس بنا پر اور بھی میں نے اس انتخاب کے بعض اشعار کے مطالب کی اشاعت کو ضروری سمجھا ہے۔

غالب اردو شاعری میں محض ایک سنگ میل نہیں بلکہ روشنی کے ایک منارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا اردو ادب پر جس قدر گہرا، چوکھا اور لازوال رنگ چڑھا ہوا ہے اور انھوں نے فکر و نظر میں جو انقلاب پیدا کر دیا ہے وہ یقیناً اپنی نظیر آپ ہے۔ ان کا کلام محض خواص کے لیے محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کو عوام تک پہونچانا ایک اہم ادبی فریضہ ہے ان کے غیر متداول کلام کے ایک ایسے مختصر مگر جامع انتخاب کی ضرورت ہے کہ جو ان کے منتخب دیوان سے ندرت خیال اور لطف بیان میں کسی طرح کم نہ ہو بلکہ بآسانی اس کے تتمہ کا کام دے سکے اور جس سے ان کے عام شائقین بلا تکلف محظوظ ہو سکیں غالباً کسی کو بھی انکار نہ ہو۔ غالبیات

کے اتنے بہت سے ماہرین کے سامنے 'میں کیا اور میرا یہ انتخاب کیا۔

ع کہ ایک وہم ضعیف اور غم دو عالم ہے

بہر حال میں اس سلسلے میں اپنی یہ ناچیز کوشش اس امید کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ شاید میرے اس انتخاب کی فروگزاشتیں ہی اس بات کی محرک بنیں کہ اس کام کی مجھ سے کہیں زیادہ صلاحیت رکھنے والے حضرات، اس کی طرف متوجہ ہوں ؎

جیب نیاز عشق، نشاں دار ناز ہے
آئینہ ہوں شکستن طرف کلاہ کا

وجاہت علی سندیلوی
۲ر جولائی ۱۹۶۰ء

اشاعت بار دوم

شکر ہے کہ باقیات غالب کے دوسرے اڈیشن کی نوبت آئی۔ اس میں مجھے اکثر مقامات پر تصحیح، ترمیم اور تنسیخ کرنا پڑی ہے، بخصوصیت کے ساتھ جو کلام عبدالباری آسی صاحب کے توسل سے غالب کے نام سے منسوب تھا اور اب تحقیق سے ان کا نہیں پایا گیا اسے قلمزد کر دیا ہے اسی طرح پہلے سہواً یا لاعلمی سے جو غلطیاں ہو گئی تھیں ان کی حتی الوسع صحت کر دی گئی ہے۔ تین نئے مضامین بھی اضافہ کر دیئے گئے ہیں اپنی دوسری مصروفیات کی بنا پر غالب میرا فن نہیں بلکہ محض شوق ہے۔ میرے لیے باعث شکرگزاری ہوگا اگر ماہرین غالبیات میری فروگذاشتوں سے مجھے آگاہ کرنے کی زحمت گوارا کریں گے۔

وجاہت علی سندیلوی

۲۷ر جنوری ۱۹۶۹ء

غالبؔ کے قلم زدہ اشعار

مولانا محمد حسین صاحب آزادؔ نے غالبؔ کے متداول دیوانِ اردو کے متعلق آبِ حیات میں لکھا ہے۔

سن رسیدہ اور معتبر لوگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں غالبؔ کا دیوان بہت بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضل حق صاحب اور مرزا خاں عرف مرزا خانی کوتوال شہر مرزا صاحب کے دلی دوست تھے .... انھوں نے اکثر غزلوں کو سنا اور دیوان کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا کہ اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انھوں نے کہا خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالہ کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا۔ وہ یہی دیوان ہے جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں"۔

یہ روایت بالکل بے بنیاد ہے۔ نہ صرف خود غالبؔ کی شہادت سے بلکہ ان کے دوسرے معاصرین کی تصدیق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ غالبؔ نے اپنے کلام کا انتخاب خود کیا تھا بلکہ غالبؔ کی شخصیت اور کردار کے پس منظر میں یہ بالکل ہی ناممکن تھا کہ وہ اپنی سخن فہمی پر بھروسہ نہ کر کے اپنے کلام کے انتخاب کا کام کسی دوسرے کے سپرد کر دیتے۔

آزاد نے بھی "سن رسیدہ اور معتبر لوگوں" کی کسی قسم کی نشان دہی کرنا مناسب نہیں سمجھا جیسے وہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں بلکہ چاندنی چوک کی کوئی اڑتی پڑتی خبر سنا رہے ہوں۔ بہرحال اس روایت سے جو غلط فہمی پیدا ہو گئی تھی وہ اب پورے طور سے دور ہو چکی ہے۔

غالب نے اپنے اردو کلام کا جو انتخاب کیا تھا اس کے متعلق عبدالرزاق صاحب شاکر کو یوں لکھا تھا۔

"پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے۔" اتفاق روزگار سے اسی دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ حمیدیہ بھوپال میں زمانہ کی دست برد سے محفوظ رہ گیا۔ یہ نسخہ نومبر ۱۸۲۱ء کا لکھا ہوا تھا اور ۱۹۲۱ء میں یعنی اس کے لکھے جانے کے پورے سو سال بعد مفتی انوارالحق صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال نے اس کو پہلی دفعہ ...... نسخہ حمیدیہ کے نام سے شایع کیا۔ اس نسخے کے سات سو سے زائد اشعار متداول دیوان میں ملتے ہیں۔ لہٰذا بادی النظر میں غالب کا یہ کہنا صحیح نہیں معلوم ہوتا کہ انھوں نے اس کے صرف دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیئے تھے۔ خیال گزرتا ہے کہ چونکہ غالب انتخاب کے ایک عرصہ دراز کے بعد شاکر کو اس کے متعلق لکھ رہے تھے لہٰذا ان کی یادداشت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ غالباً وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ جب ان کا مذاق سخن بدلا اور

"مضامین خیالی" کے اشعار ان کے پایہ اعتبار سے گر گئے تو انھوں نے ایسے تمام اشعار اپنے دیوان سے خارج کر دیئے صرف دس پندرہ اشعار نمونے کے طور پر باقی چھوڑ دیئے۔ اور یہی امر واقعہ بھی ہے لیکن اس میں یہ نکتہ بھی شامل ہے کہ اکثر سنگ ریزوں کے ساتھ جواہر پارے بھی باہر پھینک دیئے گئے یعنی مضامین خیالی کے اشعار کے ساتھ بعض دوسرے بلند پایہ اشعار بھی منتخب دیوان سے باہر ہوگئے۔ اس انتخاب کے سلسلہ میں یہ بات بھی خاص طور سے توجہ طلب ہے کہ غالب نے انتخاب کے بعد بقول خود اپنے قلم زدہ اشعار کو نہ صرف "دُور" بلکہ ان کے اوراق کو "یک قلم چاک" کر دیا تھا۔ مطلب یہ کہ ان کی کوئی یادداشت اپنے پاس نہیں رکھی تھی چنانچہ نظر ثانی کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر غالب اپنے قلم زدہ اشعار پر نظر ثانی کرتے اور ان کا مقابلہ اپنے متداول دیوان کے بعض اشعار سے کرتے تو بہت سے خارج کئے ہوئے اشعار داخل اور بہت سے داخل کئے ہوئے اشعار خارج نہ کر دیتے۔ رائے نمبری میں تدریجی تبدیلی اور ترقی ہوتی ہی رہتی ہے۔ انتخاب کے وقت غالب کی عمر صرف ۲۴ سال تھی اور یقیناً اس وقت ان میں وہ بصیرت اور پختگی ہو ہی نہیں سکتی جو اس کے ۲۵ پچیس سال بعد ہو سکتی تھی اور پھر غالب کے معیار انتخاب میں رد و بدل ہونا کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔

ایک عام انسان کی طرح ایک عظیم المرتبت فن کار کی پسند اور ناپسند کے معیار بھی بدلتے ہیں۔ اس کی ایک بہت واضح مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ غالب کے ایک قدردان نے ان سے فرمائش کی کہ آپ اپنے خطوط جمع کر کے چھپوا دیجیئے۔ غالب نہ صرف راضی نہیں ہوئے بلکہ برا مان کر جواب دیا

کہ میرے خطوط کی اشاعت سے میرے "شکوہ سخنوری" کو صدمہ پہونچے گا لیکن کچھ ہی برسوں بعد غالب اپنے خطوط چھپوانے پر آمادہ ہو گئے اور دنیا نے دیکھا کہ ان کے یہ نجی خطوط جو کسی خاص فکر اور توجہ کے بغیر قلم برداشتہ لکھے گئے تھے اُردو ادب پر ایک بہار بے خزاں بن کر چھا گئے اور ان پر نہ صرف اردو ادب بلکہ دنیائے ادب بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ غالب اگر ان خطوط کے علاوہ اور کچھ بھی نہ لکھتے تب بھی محض ان کی بدولت وہ ایک قابل رشک ادبی حیثیت کے مالک ہوتے" اس سلسلے میں اگر کوئی افسوس ہے تو صرف یہ کہ امتداد زمانہ سے غالب کے نہیں معلوم کتنے خطوط ضائع ہو گئے اور مشتاقان غالب ان سے محروم رہ گئے۔

غالب کبھی طرز بیدل پر جان دیتے تھے ؎

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدل باندھا

لیکن پھر بیدل نظر انتخاب سے گر گئے۔ ایک زمانے میں میر تقی میر کے طرز سخن کو اپنانا چاہا تھا لیکن پھر اس منزل سے بھی بہت جلد گزر گئے اور خود اپنے کلام کو ان کے کلام پر ترجیح دینے لگے۔ خطوط کے متعلق غالب کی رائے میں انقلاب عظیم اوپر بیان ہی کیا جا چکا ہے۔

غالب نے کسی باقاعدگی یا احتیاط سے اپنا کلام اپنے پاس کبھی نہیں رکھا۔ خود تاسف کیا ہے کہ "میرا کلام کیا نظم کیا نثر کیا اردو کیا فارسی کبھی کسی عہد میں میرے پاس فراہم نہیں ہوا" کمالِ فن پر پہونچ کر ان کے منھ سے نکلا ہوا ہر شعر بلکہ ہر پر لطف جملہ ان کے عقیدت مندوں اور قدر دانوں کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی غالب اپنے پاس

اپنے کلام کی کوئی مستقل یادداشت نہ رکھتے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ اپنے نومشقی کے کلام کو کس لاپروائی اور بے توجہی سے رکھتے ہوں گے مالک رام صاحب نے ذکر غالب میں لکھا ہے "شاعر کو اپنے کلام کو محفوظ اور مدون کرنے کا کس قدر خیال ہوتا ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ مرزا نے کبھی اپنا کلام اپنے پاس نہیں رکھا۔ نہ کوئی بیاض ہی اس مقصد کیلئے بنائی" خود نسخہ حمیدیہ کے متعلق بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کسی ایک بیاض یا کئی مختلف بیاضوں سے مرتب کیا گیا تھا۔ انوار الحق صاحب مرتب نسخہ حمیدیہ کا خیال ہے کہ یہ نسخہ میاں فوجدار محمد خاں بھوپال کے ایک رئیس کے لیے صاف کیا گیا تھا۔ امتیاز علی صاحب عرشی مرتب نسخہ عرشی کا خیال ہے کہ یہ خود غالب کے لئے لکھا گیا تھا اور نسخہ شیرانی (جو کہ نسخہ حمیدیہ کی اصلاح شدہ نقل تھی) کی تیاری تک انھیں کے پاس رہا بہرکیف کوئی بھی صورت ہو یہ نسخہ بھی مکمل نہ تھا۔ انڈیا آفس لائبریری لندن میں اردو شعرا کے دو تذکرے موجود ہیں: تذکرہ سرور اور عیار الشعرا۔ ان دونوں میں غالب کا ذکر اور ان کے کلام کا نمونہ شامل ہے اور ان کی سکونت اکبرآباد دکھائی گئی ہے یعنی ان کی اشاعت کے وقت تک غالب دہلی بھی نہیں آئے تھے۔ ان کتابوں میں مندرج بعض اشعار نسخہ حمیدیہ میں بھی نہیں پائے جاتے ہیں۔

غالب نے اپنے کئی خطوط میں بھی اس بات پر اظہار ندامت کیا ہے کہ ان کے پاس ان کے مکمل کلام کی یادداشت کبھی نہیں رہی اور اسکا معتدبہ حصہ گم ہوگیا۔ ان کی کئی غزلیں ان کے خطوط اور ان کے دوستوں کی بیاضوں کے توسل سے شائع ہوئی ہیں جو اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ ان کی کوئی یادداشت غالب نے خود اپنے پاس نہیں رکھی۔ لہذا ان حالات

میں اس امکان کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اپنے کلام کے انتخاب کے وقت غالب کے سامنے ان کا پورا کلام موجود ہی نہیں تھا اور یہ کوئی لازمی اور قطعی بات نہیں ہے کہ جو کلام متداول دیوان میں نہیں پایا جاتا ہے اس کو غالب نے یقیناً قلم زد ہی کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر صرف ان دو اشعار کو لے لیجئے ؎

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دور ساغر کی
میری محفل میں غالب گردش افلاک باقی ہے

غالب نے ان اشعار کو اپنے خطوط میں لکھا ہے۔ غالب کو یہ پسند نہ ہوتے تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے لیکن یہ دونوں اشعار متداول دیوان میں نہیں ہیں۔ اس فرو گذاشت کی تاویل سوائے اس کے کوئی پیش ہی نہیں کی جا سکتی کہ انتخاب کے وقت یہ سامنے نہیں آئے۔ اور پھر جب ایک دفعہ شبہہ کا دروازہ کھل جاتا ہے کہ کچھ اشعار غالب کے متداول دیوان میں سہواً شامل ہونے سے رہ گئے تو قانون کے اس مسلمہ کے مطابق کہ شبہہ کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہیئے۔ یہی بات بہت سے دیگر "معتوب" اشعار کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے یعنی وہ محض سہواً متداول دیوان سے خارج کر دیئے گئے تھے۔

میری اس گزارش کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ اگر کوئی شعر ہمیں پسند ہے تو اس کے متعلق ہم زبردستی یہ فرض کر لیں کہ غالب نے اس کو قلم زد کیا ہی نہ ہوگا اور وہ محض سہواً منتخب دیوان میں شامل ہونے سے

رہ گیا یقیناً بہت سے ایسے اشعار جو آج ہمارے پسندیدہ ہیں غالب نے ناپسندیدہ قرار دے کر دیدہ و دانستہ قلم زد کردیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ بہت سے اشعار کے جو مطالب آج ہم سمجھ رہے ہیں وہ غالب کے ذہن میں نہیں تھے اور پھر معیار انتخاب اور پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے اسباب تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ البتہ میں اس امکان کی جانب ضرور اشارہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ضروری نہیں تھا کہ غالب جب اپنے کلام کے انتخاب کے لئے بیٹھے ہوں تو ان کا پورا کلام ان کے سامنے موجود ہی ہوتا۔ خود غالب کی شہادت سے اور دوسرے واقعاتی ثبوت سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے پاس ان کا پورا کلام کبھی بھی موجود نہیں رہا اور اکثر ایسے اشعار بھی منتخب دیوان میں شامل ہونے سے رہ گئے جو ان کو بہت پسند تھے۔

غالب نے اپنے منتخب دیوان اردو کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اب اس دیوان سے باہر اگر میرا کوئی متفرق کلام دستیاب ہو تو وہ مجھ سے نہ منسوب کیا جائے اور میں اُس کی تعریف و تنقیص سے معاف رکھا جاؤں اس مقولے کی روشنی میں یہ بھی ایک دلچسپ بحث اٹھ سکتی ہے کہ جب غالب نے اپنا منتخب دیوان پیش کر کے یہ لکھ دیا کہ اب اس کے باہر کا کوئی شعر میرا نہ سمجھا جائے تو گویا انھوں نے انتخاب کے متعلق نہ صرف شک و شبہ کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا بلکہ اس کے مختتم ہونے کے متعلق اس دروازے میں قفل بھی لگا دیا تو پھر اب کون سی بات باقی رہ جاتی ہے کہ جس کی بنا پر اس دروازے کو کھولنے بلکہ توڑنے کا منصوبہ بنایا جائے اور غالب کے قلم زدہ اشعار کے انتخاب کا سوال پھر سے اٹھا کر بعض اشعار کو غالب کی صاف اور واضح ہدایت کے خلاف ان کے سر منڈھنے کی کوشش کی جائے، یہ

تو وہی مثل ہوئی مدعی سست اور گواہ چست۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے اس امر کی وضاحت کی ضرورت ہے کہ ادب ذاتی ملکیت کے شکنجوں سے آزاد ہے۔ کوئی بھی ادب کسی شاعر یا ادیب کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ وہ ساری دنیائے ادب کی ملکیت ہوتا ہے اس بات کا فیصلہ کہ کس ادب پارے کو باقی اور کس کو فنا ہو جانا چاہیئے اس کے خالق یعنی شاعر یا ادیب کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ زمانے کے ہاتھوں میں ہوتا ہے جو عادتاً موتیوں کو چن لیتا ہے اور ٹھیکروں کو پھینک دیتا ہے۔ آل احمد سرور صاحب نے لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے" غالب بڑے باشعور شاعر ہیں مگر وہ بھی اپنے بہترین اشعار کا انتخاب نہیں کر سکے ہیں" اور یہ صرف غالب ہی پر نہیں موقوف دنیا کے بہت سے بلند پایہ شاعر اور ادیب اپنے شہ پاروں کا صحیح انتخاب کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کی ایک اہم نفسیاتی وجہ بھی ہے۔ شاعر اور ادیب اپنی ہر تخلیق کو اپنی ذات کے پس منظر میں دیکھتا ہے اور اس سے اپنے جذباتی تعلقات اور ذاتی محرکات کو علیحدہ نہیں کر پاتا۔ برخلاف اس کے ایک دوسرا شخص اس کو غیر جانبداری سے محض اس کے حسن و قبح کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے چنانچہ اکثر دونوں کا زاویہ نگاہ نہ صرف مختلف بلکہ متضاد نتائج پیدا کرتا ہے۔

زمانہ کا مذاق۔ خوبی اور خرابی کا معیار۔ شاعری کے اقدار اور وقت کے تقاضے بدلتے رہے ہیں اور برابر بدلتے رہیں گے۔ غالب کے متداول دیوان میں ایسے بہت سے اشعار موجود ہیں جن کی پہلے وہ قدر و منزلت نہیں تھی جو اب ہو گئی ہے۔ مثال کے طور پر اسی شعر کو لیجئے ؎

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

انیسویں صدی میں غالباً اس شعر کے صرف یہ معنی سمجھے گئے ہوں گے کہ شاعر اپنے معشوق کے شوق زیبائش کو واضح کرنا چاہتا ہے اور اس لحاظ سے یقیناً یہ کوئی بلند پایہ شعر نہیں ہے۔ لیکن اب جبکہ مسئلہ ارتقا ایک بہت عام فہم اور مقبول عام مسئلہ بن چکا ہے تو اس شعر کی معنویت کہیں سے کہیں پہونچ گئی ہے اور اس میں مسئلہ ارتقا کی طرف ایک اشارہ سمجھ کر اس سے ایک بالکل نیا لطف اور بصیرت حاصل کی جارہی ہے اور آج اس شعر کی بے پناہ مقبولیت دیکھ کر کون ہمت کر سکتا ہے کہ اسی مصنف کا ایک دوسرا شعر قلم زدہ رکھے۔

حسن خود آرا کو ہے مشق تغافل ہنوز
ہے کف مشاطہ میں آئینہ گل ہنوز

یا اسی نوعیت کے ایک تیسرے شعر کو دیوان غالب میں شامل کئے جانے پر اعتراض کرے

ہے بکف خاک، جگر تشنۂ صد رنگ ہنوز
غنچے کے میکدے میں مست تامل ہے بہار

کیا متداول دیوان کے اس شعر کو

پینس پہ گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

آج وہ مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے جو غالب کے حلقہ احباب میں اسے محض اس بنا پر حاصل تھی کہ اس سے ایک مخصوص واقعہ کی نشاندہی ہوتی تھی۔ ہرگز نہیں۔ پھر جب غالب کے متداول کلام کے اشعار کی قدر و منزلت میں زیادتی اور کمی ہو سکتی ہے تو کیا یہی صورت غیر متداول کلام کے لئے

نہیں پیش آ سکتی ؟ کیا جب کل کا پسندیدہ شعر آج غیر پسندیدہ ہو سکتا ہے تو کیا کل کا غیر پسندیدہ شعر آج پسندیدہ نہیں ہو سکتا ؟

اختلاف معیار اور کلام کی غیر موجودگی کے علاوہ اور بھی بہت سے ایسے اسباب ہو سکتے ہیں کہ جن کی بنا پر غالب اپنے منتخب دیوان سے کوئی شعر خارج کرنے میں حق بجانب ہو سکتے تھے لیکن ہم اس کو نظر انداز کرنے میں ہرگز نہیں ہو سکتے ۔

غالب کو فارسی سے خصوصی مناسبت تھی ۔ انھوں نے اپنے اکثر پسندیدہ مطالب کو اردو اور فارسی دونوں میں کہا ہے اور ایسی صورت میں عموماً اردو کا شعر قلم زد کر دیا ہے ۔ قلم زدگی کا سبب شعر کی کوئی خرابی ہرگز نہیں تھی بلکہ صرف اردو اور فارسی کلام کو تکرار مضامین سے بچانا مقصود تھا ، مثلاً ان کا ایک قلم زدہ شعر ہے ؎

بشغل انتظار مہوشاں در خلوت شبہا
سر تار نظر ، ہے رشتۂ تسبیح کوکب ہا

اور یہی شعر دوسرے مصرع میں "ہے" کے بجائے " شد" کے تغیر کے ساتھ فارسی دیوان میں موجود ہے ۔ چونکہ ایک عام اردو داں کو غالب کے فارسی کلام پر دسترس نہیں ہوتی لہذا وہ یقیناً اس صورت سے حذف کئے ہوئے اشعار کو از سر نو اردو میں دیکھنا چاہتا ہے ۔

غالب ہمیشہ بے کار کے مقابلوں اور موازنوں سے گریزاں رہتے تھے ۔ انھوں نے اپنے دیوان میں شہزادہ جواں بخت کا سہرا غالباً اسی وجہ سے شامل نہیں کیا کیونکہ اس کے جواب میں ذوق بھی ایک سہرا لکھ چکے تھے ۔ ان کے زمانے میں اکثر اس پر بھی نکتہ چینی کی جاتی کہ کسی خاص

مصرع طرح پر کس شاعر نے کتنے قافیے صرف کئے ہیں اور کس مخصوص
قافیے کو کس شاعر نے کس طرح باندھا ہے۔ غالب اس قسم کے مقابلوں
اور موازنوں میں پڑنے کے بجائے اپنا کوئی متنازعہ شعر قلم زد کر دینا
زیادہ بہتر سمجھتے۔ وہ شاعری اور قافیہ پیمائی کو دو مختلف فن سمجھتے۔ ہم اس
قسم کے اشعار کو اب بالکل دوسری روشنی میں دیکھ سکتے ہیں۔

غالباً اکثر اشعار غالب نے اس وجہ سے بھی اپنے دیوان سے خارج
کر دیئے تھے کیونکہ ان کے سمجھنے والے بہت کم اور ان پر اعتراض کرنے
والے بہت زیادہ تھے۔ غالب انیسویں صدی کے تحقیق اور تشکیک
کے دور کے ایک بڑے بلند پایہ نمائندہ تھے اور یقیناً اپنے وقت سے بہت
پہلے پیدا ہوئے تھے۔ انھیں خود بھی اس کا بڑا شدید احساس تھا ؎

از مہر جہاں تاب امید نظرم نیست
ایں طشت پر از آتش سوزاں لبرم ریز

انھیں اگر اپنے پر پیچ فلسفیانہ اور نفسیاتی اشعار کی حسب دل خواہ
داد نہیں ملی اور اس اندیشے میں کہ کہیں وہ مہمل گو نہ قرار دیدیے جائیں
انھیں اس قسم کے اشعار قلم زد کرنا پڑے تو کوئی محل تعجب نہیں مثلاً

وصل میں دل انتظار طرفہ رکھتا ہے مگر
فتنہ تاراج تمنا کے لئے درکار ہے!

میں بڑا دقیق نفسیاتی نکتہ بیان کیا گیا ہے یا ؎

عمر میری ہو گئی صرف بہار حسن یار
گردش رنگ چمن ہے ماہ وصال عندلیب

میں وقت کا محض ایک اضافی مفروضہ ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ

دونوں اشعار یقیناً اردو زبان میں عدیم المثال ہیں لیکن ظاہر ہے کہ انیسویں صدی کے وسط میں جب کہ فرائڈ اور اینسٹن کی ان مسائل پر تحقیقات منظر عام پر نہیں آئی تھی اس قسم کے اشعار کو کس زاویہ نگاہ سے دیکھا گیا ہوگا ؟ کیا اب بھی ہم انھیں اسی طرح دیکھنا پسند کرینگے؟

اسی طرح اور بھی بہت سے مختلف امکانات پیش کئے جا سکتے ہیں کہ جن کی بنا پر غالب تو کسی شعر کو قلم زد کرنے کے لیے مجبور ہو سکتے تھے لیکن ہم اس کو نظر انداز کرنے کے لیے ہرگز مجبور نہیں ہو سکتے ۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ان کے زمانے سے اس زمانے تک معیار انتخاب میں انقلاب عظیم ہو چکا ہے ۔ پہلے اگر روایتی شاعری کا چرچا تھا اور معشوق کے سراپا اور اس کے ظلم اور عاشق کی مظلومیت کا بول بالا تھا تو اب زندگی کے حقائق پر زور رہے اور حسن وعشق کی آویزش کے ساتھ ساتھ ان کی نفسیات ، پر بھی نظر ہے تو پھر ہم کسی ادب پارے کے متعلق بدلتے اقدار سے کئے ہوئے کسی فیصلے کو مختتم اور حرف آخر کیسے مان سکتے ہیں ؟ یہ ادبی خودکشی کے مترادف ہوگا ۔

جہاں تک غالب کے اس مقولہ کا تعلق ہے کہ میرے منتخب دیوان میں جو اشعار شامل نہیں وہ مجھ سے نہ منسوب کئے جائیں اور میں انکی تعریف اور تنقیص سے معاف رکھا جاؤں تو اس کا حقیقی مفہوم ان کے کردار کی بعض اہم خصوصیات کے پس منظر میں بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے غالب کو اپنے مرتبۂ شاعری کا بڑا احساس تھا اور ہونا بھی چاہیئے تھا وہ عمومیت سے گریزاں اپنا شمار عام شاعروں میں کرانے کو سخت معیوب سمجھتے تھے حتی کہ ذوق تک کو ایک دفعہ مخاطب کر کے کہہ چکے تھے ۔

راست میگویم و از راست سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

غالب کو اپنا جتنا کلام مل سکا تھا اس کا تو وہ انتخاب کرہی چکے تھے اور باقی سے ہاتھ بھی دھو چکے تھے لہذا یہ لکھ کر کہ اب ان کے منتخب دیوان سے باہر کوئی شعر ان کا نہ سمجھا جائے انھوں نے بغیر اس خیال کے کہ اس طرح وہ نادانستہ اپنے بعض بہت اچھے اشعار سے بھی دست بردار ہو رہے ہیں انھوں نے محض اپنے اس اندیشے کا تدارک کرنا چاہا تھا کہ کہیں ان کے بعد ان کے بعض نادان دوست جوش عقیدت میں عام مذاق کے بعض ادنیٰ اشعار بھی ان کے نام سے منسوب کرنے کی کوشش نہ کریں اور اس طرح ان کے جلیل القدر منصب شاعری کو نقصان نہ پہونچ جائے اور واقعتہً غالب کا یہ اندیشہ ایک حد تک درست بھی تھا خود ان کی زندگی میں ایسے کئی واقعے پیش آچکے تھے۔ منشی شیو نرائن نے ایک مرتبہ ایک غزل غلط فہمی سے غالب سے منسوب کر دی تھی غالب نے ان کو لکھا "بھائی حاشا ثم حاشا! اگر یہ غزل میری ہو تو مجھ پر ہزار لعنت! اس سے آگے ایک شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا اور کہا کہ قبلہ آپ نے کیا خوب مطلع کہا ہے ؎

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

میں نے یہی اس سے کہا کہ اگر یہ مطلع میرا ہو تو مجھ پر لعنت... تم طرز تحریر اور روش فکر پر بھی نظر نہیں کرتے۔ میرا کلام اور ایسا مزخرف"

علائی کے ایک خط میں غلط انتساب کو "مسخ کلام" بتاتے ہوئے ایک غزل کے متعلق لکھا "اب میں دیکھتا ہوں کہ مطلع اور چار شعر کسی نے لکھ کر...... غزل بنا لی ہے۔ مقطع اور ایک شعر میرا اور پانچ شعر کسی اُلّو کے جب شاعر کی زندگی میں گانے والے شاعر کے کلام کو مسخ کر دیں تو کیا بعید ہے کہ وہ شاعر متوفی کے کلام میں مطربوں نے کیا غلط کر دیا ہو"

ان حالات میں اگر غالب نے اپنے منتخب دیوان کو مداخلت بیجا سے بچانے کے لیے یہ لکھ دیا کہ اب اس سے باہر کوئی شعر مجھ سے منسوب نہ کیا جائے تو ہرگز محل تعجب نہیں۔ لیکن یہ لکھ دینے کے بعد بھی انھیں یہ احساس ہمیشہ ستاتا رہا کہ ان کا کچھ کلام جو دیوان سے باہر ہے دیوان میں شامل ہونے کے لائق ضرور ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ ان کی دسترس سے باہر ہو چکا تھا۔ اور اس کی بازیابی کی امید موہوم پر وہ اپنے موجودہ کلام کے لیے نئے خطرات مول لینے کے لیے تیار نہ تھے ۱۸۵۹ء میں منشی شیو نرائن کو لکھا تھا "صاحب میں ہندی غزلیں بھیجوں کہاں سے ؟ اردو کے دیوان چھاپے کے ناقص ہیں۔ بہت غزلیں ان میں نہیں ہیں قلمی دیوان جو اتم اور اکمل تھے وہ لٹ گئے۔ یہاں سب کو کہہ رکھا ہے کہ جہاں بکتا ہوا نظر آ جائے لے لو تم کو بھی لکھ بھیجا .... ایک دوست کے پاس اردو کا دیوان چھاپے سے کچھ زیادہ ہے۔ اس نے کہیں کہیں سے مسودات متفرق بہم پہونچا دیئے ہیں چنانچہ 'پنہاں ہو گئیں'! 'ویراں ہو گئیں' یہ غزل مجھ کو اسی سے ہاتھ آ گئی ہے"! اپنے خطوط میں غالب کا اپنا کلام دوسروں سے طلب

کرنا غیر معمولی بات نہیں تھی وہ اپنے متداول دیوان کو مکمل سمجھتے تو
ایسا کبھی نہ کرتے غالب کے پاس ان کا پورا کلام محفوظ رہتا تو یقیناً
آج ہم ان کے منتخب دیوان میں کافی تغیر اور تبدل پاتے اور آج
اس کی شان کچھ اور ہی ہوتی غالب کی یہ ہدایت کہ منتخب دیوان
سے باہر کوئی کلام ان سے منسوب نہ کیا جائے ان کی اپنی خوشی کا نہیں
بلکہ حالات سے مجبوری کا فیصلہ تھا ہمیں اسے لکیر کا فقیر ہو کر نہیں
بلکہ ناقدانہ زاویہ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔

دیدیم کہ مے مستی اسرار ندارد
رفتیم و بہ پیمانہ فشردیم جگر ہم

نسخۂ حمیدیہ پر ایک نظر

نسخۂ حمیدیہ کی اشاعت یقیناً ہمارے ادب میں ایک گراں مایہ تاریخی اضافہ ہے جس سے غالب جیسے یگانہ روزگار کی ابتدائی جولانی طبع، پرواز تخیل اور تجرباتی شاعری کے نقوش اولیں ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ اس سے یہ پتہ تو چلتا نہیں کہ انھوں نے کون سی غزل کب کہی تھی لیکن مجموعی طور سے غالب کو واقعی غالب بننے میں کون سے ہمت شکن اور صبر آزما معرکے سر کرنا پڑے تھے اور ان کی اردو شاعری کو اپنے معراج کمال پر پہونچنے سے قبل کن ارتقائی منازل سے گزرنا پڑا تھا اس کا پس منظر بہت نمایاں طور سے واضح ہو جاتا ہے۔

نسخۂ حمیدیہ کی کتابت کے وقت غالب کی عمر صرف چوبیس سال کی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس کم عمری میں ان کا فارسی کے معتد بہ کلام کے علاوہ اردو میں تقریباً انیس سو اشعار کہہ ڈالنا ان کی غیر معمولی فطری ذہانت اور شاعرانہ استعداد کا ایک بین ثبوت ہے۔ وہ اس عمر میں اس قدر شہرت اور قبولیت عام بھی حاصل کر چکے تھے کہ ان کا کلام دہلی سے بھوپال جو اس زمانے میں ہفتوں کی دشوار گذار مسافت پر واقع تھا، ایک نادر تحفے کے طور پر پہونچایا گیا تھا۔

غالباً بہت سے لوگوں کو یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہو گی کہ

ان معرکۃ الآرا غزلوں میں سے کہ جن پر متداول دیوان غالب کی موجودہ
قدر و منزلت کی اساس قائم ہے ایک تہائی کے قریب غالب چوبیس سال
کی عمر اور قریب نصف تیس سال کی عمر سے قبل ہی کہہ چکے تھے۔

اس سلسلے میں یہ تجزیہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ غالب نے
جب پہلے پہل ۱۸۲۳ء میں اپنا اردو دیوان مرتب کیا تھا تو اس میں اشعار
کی کل تعداد ۱۰۷۰ تھی لیکن جب آٹھ سال بعد ۱۸۴۱ء میں اس کا پہلا
اڈیشن شایع ہوا تو یہ تعداد ۱۰۹۵ ہو گئی تھی یعنی آٹھ سال میں صرف
پچیس اشعار کا اضافہ ہوا تھا۔ دیوان کا دوسرا اڈیشن چھ سال بعد
۱۸۴۷ء میں چھپا۔ اس میں اشعار کی تعداد ۱۱۱۱ تھی یعنی چھ سال میں
صرف سولہ اشعار کا اضافہ ہو سکا تھا تیسرا اڈیشن ۱۸۶۱ء میں چھپا
جس میں اشعار کی تعداد ۱۸۹۶ تھی یعنی چودہ سال میں ۶۸۵ اشعار
اور کہے گئے تھے چوتھا اڈیشن ۱۸۶۲ء میں چھپا اس میں اشعار کی
تعداد ۱۸۰۲ ہو گئی تھی یعنی ایک سال میں صرف چھ اشعار اور دیوان
میں شامل کئے گئے تھے پانچواں اڈیشن ۱۸۶۳ء میں چھپا اس میں اشعار
کی تعداد ۱۷۹۵ تھی کیونکہ یہ تیسرے اڈیشن کی نقل تھا اور ایک شعر
کاتب کی غلطی سے چھوٹ گیا تھا۔ کسی شاعر کے شعر کہنے کی رفتار کسی آلے
یا مشین سے نہیں ناپی جا سکتی اور محض قیاسات کی بنا پر قطعی طور پر کبھی
نہیں کہا جا سکتا کہ ایک معینہ زمانے میں اس نے کتنے شعر کہے ہونگے
اور غالب نے تو اپنے درمیانی زمانے میں فارسی کو اپنا کر اردو شاعری
ترک کر دی تھی۔ تاہم اوپر دیئے ہوئے اعداد و شمار سے جو تیس سال
کی طویل مدت کا احاطہ کئے ہوئے ہیں صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا غالب

بہت پر گو شاعر نہیں تھے۔ انھوں نے بارہ یا پندرہ برس کی عمر میں شعر کہنا
شروع کر دیا تھا اور یقیناً اوائل عمر میں جب کہ ان کی بے فکری کا زمانہ
تھا اور شعر و شاعری کا نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا انھوں نے مقابلتہً
فکرِ سخن بھی زیادہ کی ہوگی لہٰذا کسی قدر وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا
ہے کہ ۱۸۲۱ء میں ان کا جو مجموعۂ کلام (نسخۂ حمیدیہ) مدون ہوا تھا
اور جس میں ۱۸۸۳ اشعار صرف غزل کے تھے وہ صرف دو چار سال
کی مشقِ سخن کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس کا بیشتر حصہ ان کا اس وقت کا کہا
ہوگا کہ جب ان کی عمر مشکل سے پندرہ سولہ یا سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی
اور اس کم عمری میں بھی یقیناً وہ بہت سی ایسی غزلیں بھی کہہ چکے تھے
جو بعد میں ان کے دیوان کے انتخاب میں شامل ہوئیں اور آج تک
اردو ادب کا سرمایۂ افتخار بنی ہوئی ہیں اس طرح ایک جلیل القدر فن کار
کی خصوصیات ان میں شروع ہی سے نمایاں تھیں ؎

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے
غافلاں! آغازِ کار، آئینہ انجام ہے

اس میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ غالب کا جو کلام نسخۂ حمیدیہ
میں پایا جاتا ہے اس سے بحیثیت مجموعی سلاستِ زبان۔ ندرتِ خیال۔
اور طرزِ بیان میں ان کا وہ کلام بہتر ہے کہ جو انھوں نے ۱۸۲۱ء
کے بعد کہا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غالب
کی ابتدائی ادبی کاوشیں اپنے تخیل کی بے باکی۔ تشبیہات کی عجوبہ کاری
اور موضوعات کی فراوانی کے باعث ایک بلند مرتبہ مفکر اور قادر الکلام
شاعر کی نشاندہی کرتی ہیں۔ اور اس ابتدائی کلام کے حسن و خاشاک

میں بھی ایسے ایسے گلہائے بے خزاں چھپے ہوئے ہیں جو رشک بہار کہے جانے کے مستحق ہیں اس نومشقی کے کلام میں بھی غالب کا اپنا ایک مخصوص رنگ اور تجربہ ہے اور اگرچہ اس وقت انھیں زبان وبیان اور خیالات کے باہمی ربط پر وہ اُستادانہ قدرت حاصل نہ تھی جو بعد کو ان کا طرۂ امتیاز بن گئی تھی تاہم ان کے کلام کے بلند حکیمانہ تیور اور خیال اور بیان کی مشکل پسندیاں اس بات کی صاف غمازی کرتی ہیں کہ اس شاعر کا طرز فکر اور زاویہ نگاہ عام شاعروں سے بالکل مختلف اور منفرد ہے اور یہ کوئی پست یا ادنیٰ بات تسلیم کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو سکتا۔ یہ مقلد نہیں موجد ہے۔ اس کی بے راہ روی میں بھی ایک قرینہ اور سلیقہ ہے۔ یہ راستے سے بھٹکا نہیں بلکہ اپنے لئے نئے راستے بنانے کی جستجو میں ہے شاعری میں یا تو سرے سے اس کا کوئی مقام ہی نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو صرف درجہ اول میں۔

ایک یہ خیال بہت عام ہے کہ غالب کا ابتدائی کلام نہ صرف حد درجہ مشکل اور مغلق تھا بلکہ زیادہ تر مہمل بھی تھا۔ بلاشبہ اس کلام کا معتدبہ حصہ فارسی ترکیبوں، پیچیدہ تشبیہوں غیر مانوس استعاروں اور خیالی مضمونوں کے باعث مشکل اور ایک حد تک مغلق بھی ہے لیکن اس کو مہمل ہرگز نہیں کہا جا سکتا غالب نے کبھی کوئی شعر مہمل نہیں کہا شروع شروع میں وہ بیدل کے فارسی کلام سے بہت متاثر تھے اور اس طرز سخن کو اردو کے لیے ایک بالکل عجوبہ چیز سمجھ کر اپنی اردو شاعری میں ایک بالکل نیا تجربہ کرنا چاہتے تھے، ساتھ ہی ساتھ ان کی فطری افتاد بھی اس بات کی متقاضی تھی کہ وہ عام پامال راستوں کو چھوڑ کر اپنے

لئے ایک نئی شاہ راہ بنائیں لہٰذا اپنے بے پناہ تخیل ۔ جودت طبع اور استعداد شعری کا سہارا لے کر انھوں نے محض خیالات اور تصورات کی دنیا میں اپنی شاعری شروع کر دی تھی ۔ اس میں خیالات میں ضبط و نظم کم اور ذہنی اور لفظی بازی گری زیادہ تھی ۔ حسن معنی پر اتنا زیادہ زور نہیں تھا جتنا کہ شکوہ الفاظ ندرت فکر اور پرواز تخیل ۔ یہ وجہ دوسرں کا آسمان تھا اس کو وہ اپنی زمین بنانا چاہتے تھے ۔ اپنے اظہار مطلب کے لئے وہ ایسے ایسے خیالی مفروضات پیچیدہ محاورے اور نادر تشبیہات تلاش کرتے جو عام انسانوں کے ذہن اور قیاس میں بھی نہ آسکتیں ۔ اس پر طرہ یہ کہ ان دشوار، دور از کار اور پر پیچ خیالات کے اظہار کے لئے انھوں نے جو زبان استعمال کی ہے اسے نہ تو اردو کہا جا سکتا ہے اور نہ فارسی ۔ اور اس کے لیے وہ ایک حد تک مجبور بھی تھے ۔ کیونکہ تنہا سیدھی سادی اردو اس بار گراں کو اٹھا بھی نہیں سکتی تھی ۔ خیالات ہوائی اور زبان دو آتشہ لہذا ظاہر ہے کہ کیا نتیجہ ہو سکتا تھا بہت سے اشعار پہیلیاں بن کر رہ گیے ۔ تاہم اس قسم کے اشعار کی تعداد پورے نسخہ حمیدیہ میں چار پانچ سو سے زیادہ نہیں ہے اور اس معاملہ میں بھی غالب جتنا بدنام ہیں اتنے قصور وار نہیں ہیں غالب کی ابتدائی مشکل گوئی کو بھٹکنے یا بہکنے سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جا سکتا اسے صرف ان کی تلاش اور تحقیق کی ایک منزل قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اس وقت ان کا انداز فکر ہی کچھ ایسا تھا کہ عام فہم زبان اس کی متحمل ہی نہیں ہو سکتی تھی ۔ مثال کے طور پر کیا حسب ذیل اشعار جن افکار اور خیالات کے حامل ہیں وہ کسی آسان تر زبان میں ادا کیے جا سکتے ہیں ؟

ے بامید نگاہ خاص ہوں محمل کش حسرت

مبادا ہو عناں گیر تغافل لطف عام اس کا

ے ہوں داغ نیم رنگی شام وصال یار
نور چراغ بزم سے جوش سحر ہے آج

ے وصل میں دل انتظار طرفہ رکھتا ہے مگر
فتنۂ تاراج تمنا کے لیے درکار ہے وغیرہ وغیرہ

آسی صاحب نے اس کلام کے متعلق لکھا ہے کہ "میرے نزدیک تو یہ وہ کلام ہے جو مرزا کو عوام کی صف سے علیحدہ کر کے زمرہ خواص میں سے آتا ہے اور ان کے تخیل کی رفعت کا اندازہ کراتا ہے اور ان کی وسعت نظر کی شہادت دیتا ہے"

غالب کے متعلق جہاں ضرورت سے زیادہ خوش فہمیاں ہیں وہاں بے بنیاد غلط فہمیوں کی بھی وہ فراوانی ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کے حصے میں آئی ہوں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ غالب کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ ان کے خلاف اعتراضات اور معترضین کی فوج در فوج پر بھی ایک نظر نہ ڈال لی جائے سرقہ۔ علم عروض سے ناواقفیت۔ الفاظ اور تراکیب کا غلط استعمال۔ تعقید۔ پیچیدگی مشکل گوئی۔ ہرزہ سرائی غرض کہ شاید ہی فن شاعری کا کوئی الزام ہو کہ جس کے ملزم بے چارے مرزا غالب نہ ٹھہرائے گئے ہوں اور پھر الزام لگانے والے کچھ ایسے ویسے لوگ نہیں بلکہ ایک سے ایک بڑھ کر علامۂ عصر۔ نقاد ذی مرتبت وغیرہ لیکن یہ غالب کی جاندار اور لازوال شاعری ہی کا دم خم تھا کہ ان زبردست آندھیوں کے مقابلے میں بھی اس کا چراغ اسی تابنا کی سے روشن ہے اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس کی

روشنی میں اور اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ایک بہت عام خیال ہے کہ اپنی شاعری کے بالکل ابتدائی زمانے میں غالب کے خیالات اس قدر الجھے ہوئے تھے اور ان پر فارسیت اس قدر چھائی ہوئی تھی کہ وہ آسان زبان میں شعر کہنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے تھے۔ نسخۂ حمیدیہ کا ایک سرسری مطالعہ بھی اس الزام کا بخوبی ازالہ کر سکتا ہے۔ نسخہ مذکور کے اشعار میں سے تقریباً ایک تہائی اشعار دیوان غالب میں شامل ہو کر اردو زبان کے رگ و ریشہ میں آج بھی تازہ اور صالح خون کی طرح دوڑ رہے ہیں علاوہ ازیں دیوان کے بعض بہت سہل اور رواں اشعار ۱۸۲۱ء سے قبل ہی کہے جا چکے تھے۔ ان کی تعداد قریب دو ڈھائی سو کے ہوگی۔ نمونے کے لیے صرف چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے — آئے وہ یاں کہ خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں — رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب — تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے — ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں — مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

یہ خیال کہ غالب بیشتر مشکل اور مغلق کہتے تھے اور پھر ایک دم سے انہوں نے اپنا طرز سخن بدل دیا اور آسان اور عام فہم کہنے لگے بالکل غلط ہے نسخۂ حمیدیہ میں ہمیں غالب کی شاعری اور زبان کا ایک تاریخی تسلسل اور منطقی ربط ملتا ہے۔ غالب نے جس زمانے میں اپنے مشکل ترین اشعار کہے ہیں اسی زمانے میں انھوں نے اپنے بعض آسان ترین اشعار بھی

کہے ہیں۔ ان کی قوت اظہار سہل ممتنع کہنے سے قاصر کبھی نہیں رہی البتہ پہلے زیادہ تر خیالات کی پیچیدگیاں زبان پر حاوی ہوگئی تھیں پھر جب خیالات میں انقلاب ہوا تو زبان میں بھی تبدیلی ہوگئی۔ پہلے غالبؔ کے شعر کا ہدف عموماً دماغ ہوتا لہذا خیالات کی پیچیدگیاں لازمی تھیں لیکن بعد میں جب اس کا ہدف دماغ کم اور دل زیادہ بن گیا تو انھوں نے دل میں اترنے والی زبان کو خود بخود اپنا لیا۔

یہ سمجھ لینا کہ ۱۸۲۱ء سے قبل کے جتنے بھی آسان اشعار تھے وہ سب کے سب دیوان غالب میں شامل کرلئے گئے تھے صحیح نہیں ہے۔ میں مثالاً صرف چند ایسے اشعار پیش کرتا ہوں جو دیوان میں شامل نہیں ہیں۔ واضح رہے کہ نسخہ حمیدیہ میں ایسے اشعار کی تعداد بھی کم نہیں ہے ۔

ظلم کرنا گدائے عاشق پر — نہیں شاہان حسن کا دستور

کیا ہے ترک دنیا کاہلی سے — ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے — کہیں ہو جائے جلد اے گردش گردون دوں وہ بھی

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا — آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

یک نفس ہر یک نفس جاتا ہے قسط عمر میں — حیف ہے انکو جو کھوویں زندگانی مفت ہے،

جن لوگوں کا خیال ہے کہ غالبؔ کی نومشقی کا کلام سراسر دشوار اور پیچیدہ تھا انھیں شاید حیرت ہو کہ غالبؔ جب دہلی بھی نہیں پہونچے تھے۔ اس وقت بھی وہ اُردو کے اتنے سلیس اور رواں اشعار کہہ چکے تھے کہ ان پر سہل ممتنع کا اطلاق ہوتا ہے۔ یہ کلام نسخہ حمیدیہ میں بھی شامل نہیں ہے لہذا اس کی تدوین سے قبل اس کو وہ خارج کر چکے تھے۔

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے — رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسدؔ ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو آج بیداری میں ہے خواب زلیخا مجھ کو

زخم دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

نسخۂ حمیدیہ سے اس بات کا بھی ثبوت مل جاتا ہے کہ غالبؔ کوئی شعر یا غزل کہہ کر اس سے بے نیاز نہیں ہو جایا کرتے تھے بلکہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے پچھلے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالتے رہتے اور اس کو ترقی دینے کے لیے اس میں برابر ترمیم اور اصلاح کرتے رہتے تھے۔ بعض اشعار میں انھوں نے صرف ایک مرتبہ نہیں بلکہ دو دو تین تین مرتبہ اصلاح کی ہے۔ بعض اشعار کو یک قلم کاٹ دیا ہے بعض موقعوں پر نئے اشعار کہہ کر پرانی غزلوں میں شامل کر دیئے ہیں۔ اکثر کسی پوری غزل کو قلم زد کر کے اس کے بجائے اسی ردیف اور قافیوں کی دوسری غزل کہہ ڈالی ہے۔ ان اصلاحوں سے غالبؔ کے ذہنی ارتقا اور فنی استغنا کی ترقی کے ساتھ ہی ساتھ آسان پسندی کا صاف پتہ چلتا ہے۔

مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں پہلے کہا تھا ؎

آتشیں پا ہوں گداز وحشت زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

پھر اس شعر کو ترقی دے کر یوں کہا ہے ؎

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

اب نہ صرف مضمون صاف ہو گیا بلکہ دونوں مصرعے پہلے سے زیادہ چست بھی ہو گئے۔

پہلے کہا تھا ؎

عشرت ایجاد چہ بوئے گل وکو دود چراغ
جو تیری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

پھر اس شعر کی یوں ترمیم کی ہے

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

یہاں یہ اشارہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ غیر شعوری طور سے غالب اس شعر میں بیدل کے اس شعر کا ترجمہ کر گئے ہیں ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دود چراغ محفل
ہر کہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست

پہلے کہا تھا ؎ چشم خوباں سے نردش نشہ زار ناز ہے
سرمہ گویا موج دود شعلہ آواز ہے

اس صورت میں دونوں مصرعوں کے درمیان ربط کی کمی تھی۔ پہلے میں صرف آنکھ کی تعریف کی گئی تھی اور اس کا آواز سے کوئی تعلق واضح نہ ہوتا تھا اور دوسرے میں سرمہ کو شعلہ آواز کا دھواں کہا گیا تھا لیکن یہ شعلہ کیوں اور کیسے پیدا ہوا یہ ظاہر نہ ہوتا تھا اس کمزوری کو دور کر کے شعر کی یوں اصلاح کی ہے ؎

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے
سرمہ تو کہوے کہ دود شعلۂ آواز ہے

اب دونوں مصرعوں میں منطقی ربط پیدا ہو گیا اور اگر چہ دوسرا مصرعہ اپنے نقش اول سے کافی دب گیا ہے لیکن شعر کے معنی صاف ہو گئے ہیں۔ اسی طرح نسخۂ حمیدیہ میں اشعار کو زیادہ رواں اور

مطالب کو زیادہ آسان بنانے کی بیسوں اصلاحیں موجود ہیں۔ غالب کے استاد خود غالب تھے اور اگرچہ انھوں نے کبھی کسی دوسرے سے اصلاح نہیں لی لیکن خود اپنی اصلاح کرنے سے وہ غافل نہیں رہے۔ وہ خود اپنے اس شعر ؎

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسدؔ
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

کی بہترین تفسیر تھے۔ اردو میں کیا شاید ہی کسی زبان میں کوئی ایسا بڑا قابل ذکر شاعر ہو کہ جس نے خود اپنے قلم سے اپنا اتنا بڑا کلام قلم زد کر دیا ہو جتنا کہ غالبؔ نے۔

عیار جلوۂ نازش گرفتن ارزانی
ہزار بار بہ تقریب امتحانم سوخت

متداول اور غیر متداول کلام کا موازنہ

معیار انتخاب کے اختلافات اور پسند و ناپسند کی نیرنگیوں کو پورے طور سے ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بھی پوری ذمہ داری سے کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ کے غیر متداول کلام سے یعنی اس کلام سے جو ان کے منتخب دیوان سے باہر ہے اور جس کو عرف عام میں قلمزدہ سمجھا جاتا ہے صرف دس بیس نہیں بلکہ بہت کافی تعداد ایسے اشعار کی پیش کی جا سکتی ہے جو ان کے منتخب دیوان کے بہت سے اشعار کے ہم پلہ بلکہ زیادہ تر ان سے اعلیٰ اور ارفع ہیں۔ یہ بات صرف نسخہ حمیدیہ کو سامنے رکھ کر کہی جا رہی ہے جو غالب کی ابتدائی شاعری کا کارنامہ ہے ورنہ اس کے علاوہ ان کا جو بعد کا غیر متداول کلام دستیاب ہوا ہے اور جو مقدار میں بہت کم ہے اسکے قصائد، قطعات اور تاریخیں چھوڑ کر باقی کلام بلا تکلف منتخب دیوان کا ہم مرتبہ کہا جا سکتا ہے اور دونوں کی آمیزش شیر و شکر کی طرح ہو سکتی ہے

یہ خیال کہ نوعمری اور نو مشقی کے کلام سے ہمیشہ بعد کا کلام بہتر ہوتا ہے یعنی ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول

ہر موقع اور ہر محل پر درست نہیں ہو سکتا اور یہ کلیہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں ہے۔ جو امنگ اور اپج جو جدت اور آمد اور جو تخلیقی جذبہ نقش اول میں کارفرما ہوتا ہے وہ نقش ثانی کو نصیب ہی نہیں ہو سکتا۔ نقش اول بناتے وقت

نقاش ایک نیا اور اچھوتا نقش بنانے کی فکر میں ہوتا ہے۔ نقش ثانی بناتے وقت وہ صرف نقش اول کو ترقی دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایجاد نہیں اصلاح کرتا ہے۔ اور ایک جدید نقش اور ایک بہتر نقش میں جو فرق ہو سکتا ہے وہ اہل نظر بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ نقش ثانی کے نقش اول سے بہتر ہونے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں لیکن نقاش کی شخصیت کی صحیح ترجمانی اس کا نقش اول ہی کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ غالب کی نومشقی کا بہت سا کلام واقعی قلم زد کئے جانے ہی کے لائق تھا کیوں کہ بازار میں اس جنس عجیب کا کوئی خریدار نہ تھا لیکن اس سے بھی انکار کرنے کی جرأت نہیں کی جا سکتی کہ ان قلم زدہ اشعار کی راکھ میں جو بعض انگارے چھپے رہ گئے تھے وہ قدر و قیمت میں لعلہائے شب تاب سے کم نہیں کہے جا سکتے اور اکثر غالب کے نقش اول کو ان کے نقش ثانی پر وہ فوقیت حاصل ہے کہ نقش ثانی نقش اول کو صرف آئینہ دکھاتا رہ جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی پہلی کوشش میں جس بلندی پر پہونچ جاتا ہے بعد کی کوششوں میں وہاں تک پہونچنے میں ناکام رہتا ہے۔

غالب کے غیر متداول یا قلم زدہ کلام کو منتخب کر کے دیکھا جائے تو وہ منتخب دیوان کے کلام سے کسی حیثیت سے کم تر یا کم مایہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کلام میں طرز ادا اور اسلوب بیان کی وہ صفائی نہ ملے جو بعد میں غالب کا طرہ امتیاز بن گئی تھی لیکن اس میں نئے نئے موضوعات کی فراوانی کے ساتھ ہی ساتھ صنعت ایجاد، جوش نگاہ، اور نشاط تصور کی وہ سرشاریاں اور کرشمہ سازیاں ملتی ہیں کہ مذاق سلیم یہ باور کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا کہ ان اشعار میں سے بیشتر دیدہ و دانستہ

منتخب دیوان سے خارج کر دیئے گئے تھے اور ان کے اخراج میں سہو اور کلام کی گم شدگی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔

دیوان غالب کے چند مخصوص اشعار میں سے یہ شعر بھی ہے ؎

لرزتا ہے مرا دل زحمت مہر درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خار بیاباں پر

یا اسی کا ہم پلہ یہ شعر سمجھا جاتا ہے ؎

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

لیکن اسی نوعیت کے یہ دو اشعار قلم زد کر دیئے گئے ہیں اور حسن مذاق انگشت بدنداں رہ جاتا ہے ؎

خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسد
سرتا بپا گذارش ذوق سجود تھا

میں چشم وا کشادہ و گلشن نظر فریب ؎
لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

متداول دیوان کا ایک بہت مشہور شعر ہے ؎

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشہ میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

لیکن یقیناً اس سے بہتر یہ شعر ہے جو نہیں معلوم کیوں دیوان سے باہر کر دیا گیا ہے ؎

ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے
کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

متداول دیوان کا ایک انتہائی مقبول شعر ہے ؎

کرتے کس منھ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہری یاران وطن یاد نہیں

اور غالباً اس سے بھی بڑھ چڑھ کر دیوان کا یہ شعر سمجھا جاتا ہے ؎

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے
یا بیاں کیجے سپاس لذت آزار دوست

لیکن کیا ان دونوں اشعار ہی کی صف میں مندرجہ ذیل قلم زدہ اشعار کو جگہ نہیں دی جا سکتی؟

جواب سنگدلی ہائے دشمناں، ہمت!
ز دست شیشۂ دل ہائے دوستاں، فریاد!

؎ عیادت ہائے طعن آلود یاراں زہر قاتل ہے
رفوئے زخم کرتی ہے بنوک نیش عقرب ھا

دیوان کا ایک بہت بلیغ شعر ہے ؎

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

لیکن اس شعر سے کہیں بہتر یہ دو اشعار ہیں جو بدقسمتی سے منتخب دیوان میں شامل کئے جانے کے لائق نہیں سمجھے گئے۔

؎ حسن خود آرا کو ہے مشق تغافل ہنوز
ہے کف مشاطہ میں آئینہ گل ہنوز

؎ ہے کف خاک، جگر تشنۂ صد رنگ ظہور
غنچے کے میکدے میں مست تامل ہے بہار

منتخب اشعار کا ایک بہت نادر شعر ہے ؎

ہے پرے سرحد ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہل نظر قبلہ نما کہتے تھیں

لیکن افسوس کہ یہ شعر دیوان سے باہر ہے ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا   واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

دیوان کا ایک بے پناہ شعر ہے ؎

آتا ہے داغ حسرت دل کا شمار یاد!
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

اب اس کے مقابلے میں نہ سہی اس کے بعد یہ دو قلم زدہ اشعار بھی پیش نظر رکھے جائیں تو کچھ زیادہ غیر مناسب نہ ہوگا ؎

تماشائے گلشن! تمنائے چیدن!   بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم؟
کس کو دوں یارب حساب سوزنا کیہائے دل   آمد و رفت نفس جز شعلہ پیمائی نہیں

پہلے شعر میں اپنے گناہوں کی نوعیت بتائی ہے اور اپنے گنہگار قرار دئے جانے پر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ دوسرے شعر میں در پردہ مطالبہ کیا ہے کہ میری محرومیوں کا کچھ حساب تو ضرور ہونا چاہئیے متداول دیوان کا شعر اپنی جگہ پر یقیناً شاہکار ہے لیکن دونوں قلم زدہ اشعار بھی پرسش اعمال اور احساس محرومی کے متعلق اپنی جگہ پر لاجواب ہیں۔

دیوان کا شعر ہے ؎

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل
انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

اسی خیال کو بدل کر یوں بھی کہا ہے لیکن یہ شعر قلم زدہ ہے۔

ے اگر آسودگی ہے مدعائے رنج بے تابی
نثارِ گردشِ پیمانۂ مئے روزگار اپنا

یہ شعر دیوان میں موجود ہے۔

ے دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

لیکن اس شعر کو دیوان سے حذف کر دیا گیا ہے ے

اے نوا ساز تماشا سر بکف جلتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں

دیوان کا شعر ہے ے

کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی

قلم زدہ شعر ہے ے

حیرت اندازِ رہبری ہے عناں گیر اے اسد
نقشِ پائے خضر، یاں سدِ سکندر ہو گیا

دیوان کا شعر ہے ے

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا!

قلم زدہ شعر ہے ے
تنگیٔ رفیق رہ تھی عدم یا وجود تھا
میرا سفر بطالعِ چشمِ حسود تھا

دیوان کا شعر ہے ے
جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد صحرا ہماری آنکھ میں یک مشتِ خاک ہے

قلم زدہ شعر ہے ؎

نگ معمار حسرتہا چہ آبادی چہ ویرانی؟
کہ مژگاں جس طرف وا ہو کف دامان صحرا ہے

دیوان کا شعر ہے ؎

ہوں تیرے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی
گوش منت کش گلبانگ تسلی نہ ہوا!

قلم زدہ شعر ہے ؎

اسدؔ فریفتۂ انتخاب طرز جفا   دگرنہ دلبری وعدۂ وفا معلوم

دیوان کے اشعار ہیں ؎

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا   یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالہ کے داغ کا
ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار   سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

قلم زدہ اشعار ہیں ؎

ربط اک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار   سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا!
داغ ہم دیگر ہیں اہل باغ، گر گل ہو شہید   لالہ چشم حسرت آلود چراغ کشتہ ہے

دیوان کا ایک بہت زباں زد عام شعر ہے۔

؎ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن اپنے فن کے متعلق ایک فن کار کے صحیح زاویہ نگاہ کی یہ قلم زدہ شعر بہت بہتر ترجمانی کرتا ہے ؎

اسد ارباب فطرت قدر دان لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسین کا

دیوان کا ایک شاہکار شعر ہے ؎

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی   وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

لیکن اس قلم زدہ شعر کے تیور بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

زنجیر یاد پڑتی ہے جادے کو دیکھ کر   اس چشم سے ہنوز نگہ یادگار ہے

اور ساتھ ہی ساتھ اس نقش اول کو بھی پیش نظر رکھئے۔

؎ بیش از نفس، بتاں کے کرم نے وفا نہ کی
تھا محمل نگاہ بدوشِ شرار حیف

متداول کلام کے بعض بہت اچھے اشعار سے غیر متداول کلام کے بعض اشعار کا جو ایک بہت سرسری مقابلہ اور موازنہ اوپر پیش کیا گیا وہ تھوڑی سی توجہ اور محنت سے اور زیادہ تفصیل سے پیش کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ منتخب دیوان کے بعض کم تر حیثیت کے اشعار پر جو صرف روایتی شاعری کی ترجمانی کرتے ہیں نظر کی جائے تو بعض قلم زدہ اشعار کے جو جدت خیال کے بہترین نمونے کہے جا سکتے ہیں اور بھی جوہر کھل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر میں منتخب دیوان کے صرف چند اشعار پیش کرتا ہوں ؎

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں   وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

ہے کیا جو کس کے باندھئے میری بلا ڈرے   کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے   اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

ضعف سے نقش پئے مور ہے طوق گردن   تیرے کوچے سے کہاں طاقت رم ہے ہم کو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پانو
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پانو

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانوْ
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیر زن کے پانوْ

پینس پہ گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اسدؔ خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

لیتا ہوں مکتب غم دل میں سبق ہنوز!
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

یہ اشعار اگر منتخب دیوان سے خارج کر دیئے جاتے تو اس کی لطافتیں کم ہونے کے بجائے غالباً بڑھ جاتیں لیکن بدقسمتی سے مندرجہ بالا اشعار کے بجائے حسب ذیل قسم کے اشعار منتخب دیوان سے خارج کر دیئے گئے ہیں جو اپنی شمولیت سے نہ صرف اس کی دل آویزیوں میں چار چاند لگا دیتے بلکہ اس کے موضوعات کی فراوانی میں بیش بہا اضافے کا باعث ہوتے ہے

کس کا خیال آئینہ انتظار تھا؟
ہر برگ گل کے پردے میں دل بیقرار تھا

بصورت تکلف بمعنی تاسف
اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

عروج نا امیدی، چشم زخم چرخ کیا جانے
بہار بے خزاں از آہ بے تاثیر ہے پیدا

آ ئی یک عمر سے معذور تماشا نرگس
چشم شبنم میں نہ ٹوٹا مژۂ خار ہنوز

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی
سر خوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

آتش افروزی یک شعلہ ایما تجھ سے
چشمک آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے

طاؤس خاک حسن نظر باز ہے مجھے ! ہر ذرہ چشمک نگہ ناز ہے مجھے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

گل غنچگی میں غرقہ دریائے رنگ ہے اے آگہی فریب تماشا کہاں نہیں

اسد جان نذر الطافے کہ ہنگام ہم آغوشی

زبان ہر سر مو حال دل پرسیدنی جانے

یقیناً ہم غالب کے غیر متداول کلام کو (جو بیشتر ان کی نو مشقی اور ابتدائی دور کی شاعری کی یادگار ہے اور مقابلتہً پیچیدہ اور مشکل بھی ہے اور کچھ محض فرمائشی اور روایتی ہے اور جس کی اہمیت تاریخی زیادہ اور ادبی کم ہے) ان کے منتخب کلام کے ساتھ جگہ نہیں دے سکتے ورنہ ان کے "شکوہ سخنوری" کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ جائے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کلام کے بعض بلند پایہ اشعار کو جو ہر اعتبار سے ہمارے ادب کے لیے طرۂ امتیاز ہو سکتے ہیں اگر ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس تعصب سے دیکھتے ہیں کہ جب خود غالب ہی ان سے کنارہ کش ہو چکے تھے تو اب ان ادبی یتیموں کا کوئی ٹھکانہ باقی نہیں رہا تو ہم خود اپنے ادب کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ہمیں فرداً فرداً ہر شعر کو اس کے مرتبے اور حیثیت کی بنا پر دیکھنا اور پرکھنا چاہیئے اور اگر کہیں سنگ و خشت کے ساتھ کوئی گوہر آبدار بھی قعر گمنامی میں پھینک دیا گیا ہے تو اسے چن کر اپنے ادب کے جواہر پاروں میں مناسب جگہ دینی چاہیئے۔ غالب نے ہمارے لیے اپنے گراں مایہ کلام کا جو بے بہا سرمایہ چھوڑا ہے وہ ایک حد تک تنہا اردو زبان کی بقائے دوام کا ضامن ہو سکتا ہے اور اگر ہم اس کا مناسب انتخاب ترتیب اور تدوین کرنے سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکے تو یقیناً یہ ہماری بہت

بڑی احسان فراموشی اور بدقسمتی ہوگی۔

چشم بے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ
بزبان عرمن فسون ہوس گل تاچند؟

ایک نئی دریافت

یہ کتاب مطبع میں زیر اشاعت تھی اُس وقت یہ خبر ملی کہ غالب کا ایک قلمی دیوان امروہے میں ملا ہے۔ میں نے دریافت کیا تو معظمی عرشی صاحب نے مطلع فرمایا کہ یہ نسخہ تقریباً ۱۲۳۱ھ (۱۸۱۶ء) کا نوشتہ ہے اور خود غالب کے قلم کا ہے اس میں متعدد غزلیں ایسی ہیں جو نسخۂ بھوپالی میں نہیں ہیں نیز کچھ اصلاحیں نئی ہیں۔ اس میں دو رباعیاں اُردو کی اور گیارہ بارہ فارسی کی نئی ملی ہیں۔

اس نسخے کی سب سے بڑی اہمیت تو یہ ہے کہ یہ خود غالب کا لکھا ہوا ہے اور پھر اب تک جتنے بھی غالب کے قلمی دیوان منظرِ عام پر آئے ہیں اُن میں سب سے قدیم یہی ہے۔ اس کی افضلیت مسلّم ہے۔ ۱۸۱۶ء میں غالب کی عمر صرف ۱۹ سال تھی۔ اس نسخے سے یہ بھی پتا چل جائے گا کہ اس نوعمری میں غالب کون سی وہ غزلیں کہہ چکے تھے جو ان کے متداول دیوان میں شامل ہیں۔

اس نسخے کی دریافت ایک بہت ہی دُور رس اور معرکہ آرا واقعہ ہے لیکن اس کے متعلق اس کی اشاعت کے بعد ہی کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

وجاہت علی
۱۲ مئی ۱۹۶۹ء

غالبؔ کی شاعری کے بنیادی محرکات

غالب کے غیر متداول کلام کا جو انتخاب پیش کیا جا رہا ہے وہ بنیادی طور سے انھیں خصوصیات کا حامل ہے جو غالب کے متداول کلام میں پائی جاتی ہیں اور ان خصوصیات پر بہت سے ماہرین اتنا بہت لکھ چکے ہیں کہ اس موقع پر ان کے متعلق کوئی روایتی اور سرسری تبصرہ کرنا نہ صرف غیر ضروری بلکہ قلم زدہ اشعار کے اس مختصر انتخاب میں صرف خلط مبحث کا باعث ہوگا۔ البتہ غالب کے کلام میں جو مفکرانہ رومانیت بڑی شدت سے کارفرما نظر آتی ہے اس کا بڑا حصہ چونکہ ان کے ابتدائی کلام میں بھی جلوہ گر ہے لہٰذا اس کی روشنی میں غالب کی شاعری کے بنیادی محرکات پر کچھ معروضات پیش کرنا یقیناً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

غالبؔ بنیادی طور سے تخیلات کے شاعر تھے۔ وہ ایک بڑے باشعور ماہر نفسیات اور مصور جذبات بھی تھے لیکن افتاد مزاج یہ تھی کہ انھیں دل کے تسخیر کرنے سے زیادہ دماغ کے مسحور کرنے میں اپنے "انا" کی تسکین ملتی تھی۔ سچ پوچھیے تو ان کی شاعری کی حقیقی جولانگاہ وہی "بے دلانہ" فضا تھی جہاں وہ روایتی قید و بند سے آزاد ہو کر محض اپنے تخیلات کے آسمان بناتے رہتے ہے

واں پر افشانِ دامِ نظر ہوں جہاں اسدؔ　　صبحِ بہار بھی، قفسِ رنگ و بو نہ ہو

لیکن چونکہ کوئی بڑا فن کار محض خلا میں اپنی روایات ۔ ماحول اور گردوپیش سے بے نیاز ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا لہذا غالب کو بھی اپنے آسمانوں سے زمین پر اترنا اور زندگی کی حقیقتوں کو ساتھ لے کر چلنا پڑا تھا۔

۵ باعث واماندگی ہے عمر فرصت جو مجھے
کر دیا ہے پا بہ زنجیر رم آہو مجھے

اکثر غالب کے متعلق اعتراضاً کہا جاتا ہے کہ ان کا کوئی مستقل فلسفہ زندگی نہیں تھا۔ اسی نہج سے غالباً ہمالیہ پر بھی اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس کے اوپر چھت نہیں ہے۔ کیا شاعری یا زندگی کا کوئی مستقل فلسفہ ہو بھی سکتا ہے ؟ دائروں اور حلقوں کے درمیان خط مستقیم کی تلاش ایک سعی لا حاصل ہے غالب کی زندگی سے اگر کوئی فلسفہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو وہ انسانیت۔ اس کی کمزوریاں اور شہ زوریاں، اس کی سرشاریاں اور محرومیاں اس کی تبدیلیاں اور نیرنگیاں در حقیقت وہ فکر اور تخیل کی اس بلندی پر فائز ہیں جہاں انھیں فلسفہ کی نہیں بلکہ خود فلسفہ کو ان کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

غالب نے مافوق الفطرت انسان ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔ وہ نہ رہبر تھے نہ مصلح۔ وہ ایک عام انسان تھے اور اپنی شاعری میں ایک عام انسان ہی کے خیالات محسوسات اور جذبات کی ترجمانی کرتے تھے۔ ان کی شاعری ان کی زندگی سے بالکل ہم آہنگ اور مربوط تھی۔ اور ان کی غیر معمولی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے کہ ان کے بنائے ہوئے آئینوں میں ایک عام انسان خود اپنی ہی تصویر دیکھتا ہے۔ غالب کی متفکرانہ رومانیت کے بنیادی محرکات کا تجزیہ کیا جائے تو ہم دیکھیں گے کہ غالب زندگی سے بہت کچھ چاہتے تھے۔ ان کی یہ ہوس بیک وقت ان کے کردار کی کمزوری لیکن ان کے فن کا جوہر تھی۔

انھیں شہرت۔ محبت۔ دولت۔ امارت۔ عیش۔ عشرت۔ معشوق۔ دوست۔ شراب جوانی۔ علم۔ ہمہ دانی۔ غرض کہ ہر چیز کی ہوس تھی۔ وہ زندگی کی ہر پرلطف اور مسرت انگیز چیز سے نہ صرف محظوظ بلکہ زیادہ سے زیادہ محظوظ ہونا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ سب تمنائیں اور آرزوئیں پوری نہیں ہو سکتی تھیں لہٰذا ان کی ان بے پناہ تمناؤں اور آرزوں ہی کے تناسب سے ان کی مایوسیاں اور محرومیاں بھی تھیں۔ ان کا یہ جوش طلب اور احساس محرومی ہی ان کی شاعری میں جلوہ صد رنگ پیدا کرتا ہے۔ اس عظیم الشان قوس قزح میں اتنے بہت سے اور اتنے متضاد رنگ دکھائی پڑتے ہیں کہ آنکھیں خیرہ اور عقل حیران رہ جاتی ہے لیکن اس میں رنگوں کا حسن کم اور ان کے امتزاج کا کمال زیادہ ہے۔ یقیناً غالب کی حقیقی فن کاری اور جینیس یہی ہے کہ وہ اپنے صرف ایک یا دو بنیادی رنگوں سے اتنے بہت سے اور اتنے دیدہ فریب اور ہوش ربا رنگ پیدا کر دیتے ہیں کہ ساری فضائے بسیط پر اسرار رنگینیوں کا ایک محشرستان معلوم ہونے لگتی ہے۔

ع
کیفیت دیگر ہے فشار دل خونیں
اک غنچے سے صد ساغر گل رنگ نکالوں

غالب کا جذبہ طلب بے پناہ ہے۔ ان کی یہ تشنگی مادی کم اور روحانی زیادہ ہے

ع
وہ تشنہ سرشار تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بکیفیت ساغر نظر آوے

ع
جام ہر ذرہ ہے سرشار تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

ان کی بے چین عاشق مزاجی کے لیے ان کے گرد وپیش کا حسن کافی نہیں ہے وہ جس حسن کے متلاشی اور منتظر ہیں وہ ابھی بن سنور کر ان کے سامنے آیا ہی نہیں ہے ؎

حسن خود آرا کو ہے مشق تغافل ہنوز
ہے کفِ مشاطہ میں آئینہ گل ہنوز

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

حسن کے نامکمل ہونے کے ساتھ ہی انھیں عشق کی خام کاری کا بھی بڑا شدید احساس ہے۔

واماندہ ذوق طرب وصل نہیں ہوں
اے حسرت بسیار تمنا کی کمی ہے

چشم بے خونِ دل و دل تہی از جوش نگاہ
بزبان عرضِ فسونِ ہوس گل تا چند؟

اپنی محرومیوں اور مایوسیوں کے ہاتھوں وہ اپنی زندگی کو وبال جان سمجھتے ہیں اور اس کا ہر جگہ بڑے دردناک انداز میں اظہار کرتے ہیں۔

مجھے بادۂ طرب سے بخمار گاہ قسمت
جو ملی تو تلخ کامی، جو ہوئی تو سر گرانی

کس کو دوں یارب حساب سوز ناکیہائے دل
آمد و رفت نفس جز شعلہ پیمائی نہیں

وہ مناظر فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو انھیں انسان سے غیر متعلق پاکر انھیں انسان کا بدخواہ سمجھتے ہیں اور ان کی افسردگی میں اور بھی

اضافہ ہو جاتا ہے ؎

ستعدِ قتلِ یک عالم ہے جلادِ فلک
کہکشاں موجِ شفق میں تیغِ خون آشام ہے

سایۂ گل داغ، و جوشِ نکہتِ گل، موجِ درد
رنگ کی گرمی ہے تاراجِ چمن کی فکر میں

گل کی چاک دامانی اور شمع کی سوختہ سامانی بھی ان کے لیے قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ وہ ہر ایک چیز میں کوئی نہ کوئی کمی یا تشنگی محسوس کرتے ہیں۔ یہ ان کے احساسِ محرومی کا غیر شعوری ردِ عمل ہے۔

ہم نے سوزِ غم جگر پہ بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہاں داد

ہے مشقِ وفا، جانتے ہیں لغزشِ پا تک
اے شمع تجھے دعویٰ ثابت قدمی ہے؟

وہ اپنی محرومیوں کو محبت میں ڈوب کر بھلانا چاہتے ہیں ؎

اے چرخ خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات! لیکن بنائے عہدہ و فا استوار تر!
اسد بہار تماشائے گلستانِ حیات وصالِ لالہ عذاران سرو قامت ہے

غالب کی ذہنی محرومیوں کی جن مادی چیزوں نے سب سے زیادہ تلافی کی وہ ان کا معشوق اور شراب ہے۔ اپنی رعنائیٔ خیال اور شوخیٔ گفتار سے اپنے کلام میں غالب نے بھی ان کا دل کھول کر احسان اتار دیا ہے لیکن ان کی رومانیت یا تلاشِ مسرت کہیں بھی سستی جذباتیت یا لذت پسندی کی فریاد نہیں ہونے پائی ہے بلکہ ہمیشہ ایک صحت مند دل و دماغ کا تقاضہ رہی ہے اور اس میں ہر جگہ ندرتِ خیال اور لطفِ بیان کے ساتھ تفکر اور تدبر

بھی ملتا ہے اور اسی لیے اس کو متکلوانہ رومانیت کہا جا سکتا ہے۔ البتہ غالب کا معشوق کوئی رواتی یا خیالی مفروضہ نہیں تھا بلکہ ایک جیتا جاگتا انسان تھا اور اس سے غالب کا عشق محض خیالی یا افلاطونی نہیں تھا۔ بلکہ بیشتر جنسی کشش پر مبنی تھا۔

ے دیکھو اس کے ساعد سیمین و دست پرنگار
شاخ گل جلتی تھی مثل شمع گل پروانہ تھا

ے اسدجاں نذر الطافے کہ ہنگام ہم آغوشی
زبان ہر سر مو حال دل پرسیدنی جانے

اپنے ایک سیاہ فام معشوق کی یوں تعریف کی ہے

ے رچ گیا جوش صفائے زلف کا اعضا میں عکس
ہے نزاکت جلوہ اے ظالم سیہ فامی تری

لیکن جسمانی لذتوں سے ان کی ذہنی پیاس نہیں بجھی۔ فراق و ہجر کا تو ذکر ہی کیا ان کی بے چینیوں کا وصل سے بھی مداوا نہ ہو سکا۔

ے ہوں داغ نیم رنگی شام وصال یار
نور چراغ بزم سے جوش سحر ہے آج

وصل میں دل انتظار طرفہ رکھتا ہے مگر
فتنہ تاراج تمنا کے لیے درکار ہے!

شراب کو وہ اپنی زندگی کا جزو لاینفک سمجھتے ہیں لیکن اسکا کیف و سرور اور خود فراموشی بھی ان کے احساس محرومی کی دوا نہ بن سکی اور اس لیے وہ اکثر کم از کم زبانی اس سے بھی متنفر نظر آتے ہیں۔

ے ہے یاس میں اسد کو ساقی سے بھی فراغت

دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی
ہے بے خمار نشۂ خون جگر اسد
دست ہوس بگیر دن مینا نہ کھینچیے

واعظ اور زاہد کی خشک زندگی میں انھیں منافقت کی بو آتی ہے اور وہ اسے بشریت کے تقاضوں سے اس قدر دور سمجھتے ہیں کہ اسکا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔

۵
بسکہ ہیں در پردہ مصروف سیہ کاری تمام
آستر ہے خرقۂ زہاد کا صوف مداد
چاہے گر جنت جز آدم وارث آدم نہیں
شوخی ایمان زاہد سستی تدبیر ہے

اپنے احساس محرومی کی بنا پر ان میں ایک صحت مند جذبہ تشکیک بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ پرانے عقائد کو روایتی انداز سے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا — واماندگی شوق، تراشے ہے پناہیں
موج خمیازہ یک نشہ، چہ اسلام چہ کفر؟ — کجی یک خط مسطر چہ توہم چہ یقین

اور وہ خدا پر بھی طنز و استہزا کرنے سے باز نہیں آتے اور عبادت کے رسمی طریقوں سے متنفر نظر آتے ہیں۔

نیاز پردہ اظہار خود پرستی ہے! — جبین سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے
تماشائے گلشن تمنائے چیدن! — بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم؟

اور بالآخر وہ زہد اور رندی دونوں سے متنفر ہو کر قناعت اور بیخودی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانا چاہتے ہیں۔

ے
اسد ساغرکش تسلیم ہو گردش سے گردوں کی
کہ ننگ فہم مستاں ہے گلہ بد روزگاری کا

اسد جمعیت دل در کنار بیخودی خوشتر
دو عالم آگہی ساماں یک خواب پریشاں ہے

غالب اگر یہیں تک آ کر رک گئے ہوتے تب بھی وہ ایک بڑے شاعر کہے جاتے لیکن وہ غالب نہ ہوتے۔ لیکن وہ رکے نہیں بلکہ آگے بڑھے انھوں نے اپنی محرومیوں کا رونا تو ضرور رویا لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کا تنقیہ اور تجزیہ بھی کیا اور ان میں رفتہ رفتہ یہ تدبر پیدا ہوا کہ ان کی محرومی صرف ان کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ خود زندگی کا ایک دوسرا نام ہے اور جب انھوں نے اپنے ساتھ ساری انسانیت کو غم روزگار میں مبتلا پایا تو وہ محض "غم دل" "سے" "غم زندگی" تک پہونچ گئے۔ اور انھیں اپنا ذاتی غم کچھ ہلکا اور گوارا معلوم ہونے لگا۔

ے
زندان تحمل میں، مہمان تغافل ہیں
بے فائدہ یاروں کو فرق غم و شادی ہے

وامگاہ عجز میں سامان آسائش کہاں
پرفشانی بھی فریب خاطر آسودہ ہے

اور ان میں زیادہ ہمت اور مردانگی سے اپنی زندگی کے مصائب برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔

ے
عروج نا امیدی چشم زخم چرخ کیا جانے
بہار بے خزاں از آہ بے تاثیر ہے پیدا

خرمن بباد دادۂ دعوی ہیں ہو سو ہو

ہم یک طرف ہیں، برق شرر ریز یک طرف

اب وہ اپنی زندگی میں "تلخیوں کے بجائے شیرینیاں" تلاش کرنے لگے اور ایک حقیقت پسند بن کر غم جاوید کی مرثیہ خوانی پر عشرت امروز کی داد عیش کو ترجیح دینے لگے۔

ہوئی جس کو بہار فرصت ہستی سے آگاہی
برنگ لالہ جام بادہ بر محمل پسند آیا!

انھوں نے سمجھ لیا کہ زندگی کی مسرتیں ناتمام اور داغدار سہی پھر بھی غنیمت ہیں۔ ان سے لطف اندوز نہ ہونا یا ان کو غم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دینا کفرانِ نعمت ہے۔

سیر ملک حسن کر میخانہ ہاندر خمار
چشم مست یار سے ہے گردن مینا بہ باج

ساقی! بہار موسم گل ہے سرور بخش
پیماں سے ہم گذر گئے پیمانہ چاہیئے

اور انھیں اپنی محرومیوں کے سانچوں سے اپنے حسین تخیلات کے مجسمے بنانا آگیا اور ان کا درد محرومی جو خارجی نہیں بلکہ داخلی تھا ان کا حسن شاعری بن گیا۔

کجا مے؟ کو عرق؟ سعیٔ عروج نشۂ رنگیں تر
خط رخسار ساقی تا خط ساغر چراغاں ہے

طاؤس خاک حسن نظر بازہے مجھے
ہر ذرہ چشمک نگہ ناز ہے مجھے

غالب جب زندگی کی محرومیوں اور مسرتوں کو متوازن نگاہوں سے

دیکھنے لگے تو ان کے تفکر میں تدبر کی بھی آمیزش ہو گئی اور ان کا شعور ظرافت بیدار ہوا۔ اب وہ نہ صرف دوسروں پر بلکہ خود اپنے آپ پر اور اپنے غم پر ہنسنے لگے۔ کبھی زندگی ان کی معلم تھی اور وہ اس کے بحر ناپیدا کنار میں ڈوبتے اچھلتے بہہ رہے تھے اور اب وہ خود زندگی کے معلم بن گئے تھے اور دوسروں کو ابھرنا اور تیرنا سکھا رہے تھے۔

وہم طرب ہستی، ایجاد سیہ مستی
تسکین دہ صد محفل یک ساغر خالی ہے
خود فروشی ہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے
ہر شکست قیمت دل میں صدائے خندہ ہے

غالب کی ذہنی کش مکش اور نفسیاتی پیچیدگی کے جو مختلف مدارج بیان کئے گئے وہ سراسر مفروضات پر مبنی ہیں۔ ان سے یہ غلط فہمی ہرگز نہ پیدا ہونی چاہیے کہ غالب درجہ بدرجہ اسی طرح اپنے جذبات اور تخیلات کی منزلوں سے گذرے تھے بلکہ صرف یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ غالب کی شاعری کے پس منظر میں کس قسم کے محرکات کارفرما تھے اور ہمیں ان کے نگار خانے میں جو طرح طرح کی نوبہ نو صورتیں دکھائی پڑتی ہیں اور جن میں اکثر ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں وہ درحقیقت ان کی تلاش مسرت اور احساس ناکامی ہی کی مختلف زاویوں سے کھینچی ہوئی تصویریں اور خاکے ہیں اور یہ محض ان کے شاہ کار موقلم کا کمال ہے کہ ہر تصویر اور ہر خاکہ اپنی ایک الگ اور نئی بہار دکھا رہا ہے۔

ربط شیرازہ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا

ایک زاہد خشک اور رند لا ابالی میں بظاہر بعد المشرقین نظر آتا ہے لیکن جب ہم اس زاویہ نگاہ سے غور کرتے ہیں کہ یہ دونوں صورتیں حقیقی زندگی سے فرار کی ہیں تو ہم ان دونوں کو توام سمجھنے لگتے ہیں۔ اسی طرح غالب کی سرمستیوں اور بیزاریوں کے درمیان بڑا اختلاف دکھائی پڑتا ہے۔ لیکن ان دونوں کے محرکات بنیادی طور سے ایک ہی ہیں ان کی زندگی سے لطف اندوز ہونے کی بھرپور خواہش اور اس کے رد عمل میں شدید احساس محرومی اور یہ دونوں ہی باتیں اس قدر عامتہ الورود ہیں کہ ایک عام انسان غالب کو ایک عظیم المرتبت شاعر سمجھتے ہوئے بھی اپنے آپ سے بہت قریب پاتا ہے اور اکثر وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ شاید اسی کا دل غالب کے سینے میں بھی دھڑک رہا تھا۔ اور وہ کبھی اسی کے دماغ سے سوچا کرتے تھے غالب کی مفکرانہ رومانیت زندگی کے بنیادی تقاضوں کی پوری طرح آئینہ دار تھی اسی کو چاہیے فلسفہ غالب کہہ لیجیئے چاہے فلسفہ زندگی! ورنہ یوں تو نہ زندگی کا کوئی مستقل فلسفہ ہے اور نہ غالب کا ہمیں محرکات ملتے ہیں لیکن ان کے درمیان کوئی فلسفہ سمجھ میں نہیں آتا۔

غالب کو نذر عقیدت پیش کرنے کے لیے کچھ اور کہنے کے بجائے غالبؔ خود انھیں کا یہ شعر زبان پر لانا زیادہ مناسب ہو گا۔

طاؤس در رکاب ہے ہر ذرہ آہ کا
یارب نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا

غلطیہائے مضامین مت پوچھ

یوں تو ہر شاعر اپنے کلام میں وقتاً فوقتاً ترمیم، تنسیخ اور اصلاح کرتا ہی رہتا ہے لیکن اس نوعیت سے کبھی اردو ادب میں غالب کو ایک عدیم المثال حیثیت حاصل ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ابتدائی دور کے کلام پر اکثر نظر ثانی کرتے رہے اور اس کا متعدد بار انتخاب کیا بلکہ انہوں نے اپنے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں، اپنے موضوعات سخن میں حتیٰ کہ زبان میں، رفتہ رفتہ حیرت انگیز تبدیلی پیدا کر کے اپنے پچاس ساٹھ یا سو دو سو اشعار نہیں۔ بلکہ ایک ہزار سے زائد اشعار کو، جن پر وہ کبھی فخر کرتے اور اپنا طرۂ امتیاز سمجھتے، قلم زد کر کے اپنے دیوان سے خارج کر دیا تھا۔

کہنے میں تو یہ ایک بہت معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے کہ غالب پہلے مشکل اشعار کہتے لیکن جب اس سلسلے میں ان پر اعتراضات کی بوچھار ہوئی تو وہ عام فہم زبان میں شعر کہنے لگے، گویا کہ یہ کوئی ایسی ہی غیر اہم بات تھی جیسے کہا جائے کہ غالب پہلے ایک مکان میں رہتے تھے لیکن جب وہاں کا ماحول انھیں راس نہیں آیا تو وہ ایک دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔ لیکن دراصل یہ کوئی ایسا آسان مرحلہ نہیں تھا۔ جو شاعر پہلے اس انداز سے فکر سخن کرتا ہو۔ ؎

شوخیِ نیرنگ، صیدِ وحشتِ طاؤس ہے

دام سبزے میں ہے، پروازِ چمن تسخیر کا

یا

لذّتِ ایجادِ ناز، افسونِ عرضِ ذوقِ قتل
نعل آتش میں ہے تیغِ یار سے نخچیر کا!

وہ جب اس طور سے کہنے لگے ؎

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

یا

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

تو سمجھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ اس تعجب خیز تبدیلی کے لیے شاعر کو کتنی دل سوزی اور جگر کاوی کرنا پڑی ہوگی اور اپنے فکر و فن پر اس قسم کی جلا کرنے سے پیشتر اسے کیسے کیسے دشوار گذار اور صبر آزما مراحل اور ہفت خواں طے کرنے پڑے ہوں گے۔ اس کے لیے غالب ہی کی زبان میں یوں کہا جا سکتا ہے ؎

بوادیٔ کہ در آں خضر را عصا خفتہ ست
بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفتہ ست

بسا اوقات غیر محتاط راویوں کے ایسے بیانات جن میں حقیقت کم اور قیاس آرائی زیادہ ہوتی ہے دوسرے لوگوں کے مختلف پیرایوں سے بڑے تواتر کے ساتھ دہرانے کے باعث مسلّمہ روایتیں بن کر مقبولیت عام حاصل کر لیتی ہیں، حتیٰ کہ بعد میں محتاط حضرات بھی ان کے متعلق کسی

تحقیق یا تجسس کا دروازہ کھولنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے۔ غالب کے ابتدائی دور کے کلام کے متعلق کچھ بعض ایسی روایتیں رواج پا چکی ہیں جن کی اساس اصلیت سے زیادہ افسانے پر ہے اور جن کے مجموعی تاثر سے غالب کی ادبی شخصیت کے تصور کو ایک گمراہ کن صدمہ پہونچتا ہے۔

مروجہ روایتوں کی بنا پر غالب کی ابتدائی شاعری کے متعلق کچھ اس قسم کی غلط فہمیاں عام طور سے رائج ہو گئی ہیں۔

(۱) غالب کے ابتدائی دور کا کلام نہ صرف مشکل، مغلق بلکہ ایک حد تک مہمل تھا۔ اس قسم کی فکر سخن ایک ذہنی ورزش سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی اور وہ ادبی حیثیت سے بالکل ہی لائق اعتنا نہیں ہے۔

(۲) اپنی اس بے راہ روی پر خود غالب کی نظر نہیں گئی بلکہ اپنے ہم عصروں کے طنز اور استہزا سے لاچار ہو کر انہیں اپنے اس بے سر و پا کلام کو قلم زد کر دینا پڑا۔

(۳) اپنے مشکل اور مغلق اشعار قلم زد کرتے ہی غالب عام مروجہ روش پر شعر کہنے لگے اور اس کے لیے وہ خود نہیں بلکہ ان کے معترضین قابل مبارکباد ہیں جنھوں نے غالب کے بعض بہی خواہوں کی مدد سے ان کو آسان زبان میں شعر کہنے پر مجبور کر دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

لیکن جب ہم کھلے دماغ سے غالب کے ابتدائی کلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ایک بالکل ہی دوسری حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔

غالب ۲۷ر دسمبر ۱۷۹۷ء کو آگرے میں پیدا ہوئے تھے اور غالباً سولہ سترہ سال کی عمر میں انھوں نے آگرے سے منتقل ہو کر دلی میں مستقل سکونت اختیار کی تھی۔ انڈیا آفس لائبریری (لندن) میں اردو شعرا کے دو تذکروں

کے قلمی نسخے، جن پر تاریخ تصنیف درج نہیں ہے، موجود ہیں، تذکرہ سرور اور عیار الشعرا ان دونوں میں غالب کا مسکن اکبرآباد (آگرہ) بتایا گیا ہے یعنی اس وقت تک وہ آگرے سے دہلی بھی نہیں پہونچے تھے۔ ان تذکروں میں غالب کے اشعار کا جو انتخاب ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ اس زمانے میں وہ عام مروجہ شاعری کے انداز پر شعر کہتے تھے اور اس وقت تک وہ مذاہب اور تبدیل سے زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے۔ البتہ ان کی وقت نظری اور جدت پسندی اس بالکل ابتدائی کلام میں بھی نمایاں تھی مثلاً ۵

محفل شمع عذاراں میں جو آجاتا ہوں
شمع ساں میں تہ دامانِ صبا جاتا ہوں

پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لیے اسدؔ
ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے وغیرہ وغیرہ

مذکورہ بالا تذکروں میں کچھ ایسے بھی اشعار ملتے ہیں جو نسخہ بھوپالی میں بھی جو ۱۸۲۱ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ اور اب تک غالبؔ کے کلام کے جتنے بھی قلمی نسخے دریافت ہوئے ہیں ان میں سب سے پرانا ہے۔ نہیں موجود ہیں یہی نسخہ ۱۹۲۱ء میں نسخہ حمیدیہ کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ اس سے اس خیال کو بھی تقویت ملتی ہے کہ غالبؔ نے اپنے کلام کا سب سے پہلا انتخاب نسخہ بھوپالی کو ترتیب دیتے وقت کیا تھا۔ اور اس وقت ان کی عمر ۲۴ سال سے بھی کم تھی۔ اور یہ بات بھی بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اپنے کلام میں بلکہ اپنے طرز کلام میں از خود تبدیلی اور ترقی کرنے کا جذبہ غالب میں بہت چھوٹی عمر سے موجود تھا۔

جو لوگ غالب کے ابتدائی دور کے کلام کی بابتہ محض بعض روایتوں کی بنا پر یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ سب کا سب نہ صرف مشکل اور مغلق تھا بلکہ مضامین خیالی اور دور دراز کا تشبیہوں کے باعث شاعری سے زیادہ چیتاں تھا انہیں شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ موجودہ متداول دیوان جس کو ہم اردو کا سب سے بڑا سرمایہ سخن سمجھتے ہیں اس کی اساس اسی ابتدائی دور کے کلام پر ہے۔ یہ دعویٰ محض قیاسی نہیں بلکہ حقائق پر مبنی ہے۔

غالب کے متداول دیوان میں غزل کے تقریباً ۱۴۳۵۔ اشعار ہیں ان میں سے تقریباً ۹۳۷ نسخہ بھوپالی (تاریخ تحریر ۱۸۲۱ء) اور نسخہ شیرانی (تاریخ تحریر ۱۸۲۶ء) میں پائے جاتے ہیں۔ اس شمار میں نسخہ شیرانی کے حاشیہ کے اشعار نہیں شامل کئے گئے ہیں کیونکہ وہ ۱۸۲۶ء کے بعد کے بھی ہو سکتے ہیں۔ ان دونوں نسخوں کی تحریر کے وقت غالب کی عمر علی الترتیب ۲۴ اور ۲۹ سال تھی اور ان دونوں نسخوں کو غالب کے ابتدائی دور ہی کا کلام کہا جا سکتا ہے کیوں کہ ان سے پہلے کا ان کا کوئی مجموعہ ابھی تک منظرِ عام پر نہیں آیا ہے۔

نسخہ بھوپالی کے حاشیے پر، یا آخر میں جو غزلیں درج ہیں ان کے متعلق تو بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس نسخے کی تحریر اور نسخہ شیرانی کے ۱۸۲۶ء میں تحریر کئے جانے کے درمیانی زمانے کے اضافے ہیں۔ لیکن خود نسخہ بھوپالی کے متن میں درج قریب ۶۵۴۔ ایسے اشعار ہیں جو متداول دیوان میں اس وقت بھی موجود ہیں۔ اور اس طور سے یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ موجودہ متداول دیوان کا ایک تہائی سے زاید کلام اس وقت کا ہے جب غالب کی عمر ۲۴ سال بھی نہ تھی۔ اور یہ تو ظاہر ہی ہے کہ انہوں

نے یہ سب کلام نسخہ بھوپالی کی تحریر ۱۸۲۱ء کے وقت فوراً نہیں کہا ہوگا بلکہ یہ ان کی برسہا برس کی کمائی ہوگا۔ یقیناً اس کا معتدبہ حصہ انہوں نے ۱۵ یا ۱۸ برس کی عمر میں بھی کہا ہوگا۔

اس بالکل ابتدائی دور میں وہ جو معرکہ آرا غزلیں کہہ چکے تھے اور جو بہت معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ اس وقت متداول دیوان میں موجود ہیں ان میں سے چند حسب ذیل ہیں۔

ع نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا

ع کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا

ع دہر میں نقش وفا وجہ تسلی نہ ہوا

ع وہ مری چینِ جبیں سے غم پنہاں سمجھا

ع بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا

ع پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

ع حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد

ع لرزتا ہے میرا دل زحمت مہر درخشاں پر

ع نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز

ع آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک

ع غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں

ع جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں

ع درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے

ع آ کہ میری جان کو قرار نہیں

ع نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی

ع جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی

ع آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے

ع شبنم بہ گل لالہ نہ خالی زادا ہے

چوبیس سال کی عمر سے پہلے اگر غالب، بیدل کے متعلق کہہ چکے تھے

ے مطرب دل نے میرے تارِ نفس سے غالب
ساز بر رشتہ پے نغمۂ بیدل باندھا

ے اسد ہر جا سخن نے طرح باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیٔ بیدل پسند آیا

تو میر تقی میر کے متعلق بھی اپنی یہ رائے ظاہر کر چکے تھے:۔

ے میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں،

ے غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جس ابتدائی دور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ غالب صرف بیدل صاحب یا بخاری سے حد سے زیادہ متاثر تھے اسی دور میں وہ میر کے صاحب کمال ہونے کے بھی معتقد تھے اور جب معتقد تھے تو ان کے رنگ کو بھی اپنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ افتاد مزاج کی ہم آہنگی کے باعث وہ انداز بیان میں مرزا سودا سے بھی بہت زیادہ قریب ہو گئے تھے۔ ظہوری، عرفی، نظیری، سے بھی وہ کافی بہرہ مند ہو چکے تھے اور ان کا بھی اچھا بھلا رنگ ان پر چڑھ چکا تھا۔ چنانچہ اس دور کو صرف غالب کا تجرباتی دور کہا جا سکتا ہے۔

۵ چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں — !

غیر معمولی نادر الکلامی کے علاوہ جس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ فارسی میں معتد بہ کلام کے علاوہ چوبیس سال کی عمر میں وہ قریب دو ہزار اشعار اردو میں کہہ چکے تھے، غالب کی طبیعت میں نہ صرف بلا کی دراکی، اپج اور جدت پسندی تھی بلکہ اپنی فنی صلاحیتوں کا زبردست شعور اور احساس بھی تھا۔ ان کے سامنے کئی عظیم المرتبت شعرا کے آئیڈیل تھے اور اگرچہ ایک زمانے میں بیدل ان کے ذہن اور فکر پر چھا گئے تھے لیکن وہ دوسروں کی جانب سے بھی آنکھیں بند نہیں کیے ہوئے تھے۔ بیک وقت ان کے صنم کدے میں کئی بت تھے لیکن زبانی اقرار کے باوجود وہ ان میں سے کسی کی بھی پرستش نہیں کرتے بلکہ ان کا سب سے بڑا آئیڈیل غالب اور صرف غالب تھا۔ ان کا جلیل القدر سے جلیل القدر پیش رو ان کے لئے صرف سنگ میل کی حیثیت رکھتا کیونکہ وہ ان سب سے آگے نکل جانے کی ہمت اور حوصلہ رکھتے اور اپنی منزل وہ خود اپنے آپ کو سمجھتے۔

اس مختصر سے مضمون میں نہ تو اس کا موقع ہے کہ غالب کے ابتدائی دور کے کلام میں جن شعرا کے طرز سخن کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ ان کی نشاندہی کی جائے اور نہ اس کا کہ اس کلام پہ کوئی تبصرہ کیا جائے۔ یہاں صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ اگرچہ اس سلسلے میں کوئی دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ غالب کا جو کلام نسخہ بھوپالی (مطبوعہ نسخہ حمیدیہ) میں پایا جاتا ہے اس سے بحیثیت مجموعی، انداز بیان، ندرتِ تخیل اور فنی پختگی میں وہ حصہ کلام بہتر ہے جو انہوں ۱۸۲۱ء کے بعد کہا ہے لیکن اس سے بھی انکار کی گنجائش

نہیں کہ ان کی ابتدائی کاوشیں عنقا کو بھی اپنے دام میں اسیر کر لینے کا جوش اور ولولہ رکھتیں۔ ان کے تخیل کی فلک پیمائی، تشبیہات کی عجوبہ کاری اور عمیق حکیمانہ تیور اس بات کی واضح غمازی کرتے کہ ان کا خالق کچھ کر جانے اور کوئی بن جانے کے لئے مضطرب اور بے چین ہے۔ اس شاعر کا اندازِ فکر اور طرزِ بیان عام شاعروں سے مختلف اور منفرد ہے۔ یہ کوئی پست یا ادنیٰ مرتبہ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔ یہ مقلد نہیں موجد ہے۔ اس کے انتشار اور مشکل پسندی میں بھی ایک قرینہ اور سلیقہ ہے۔ یہ راستے سے بھٹکتا نہیں بلکہ اپنے لئے نیا راستہ بنانے کی جستجو میں ہے۔ دنیائے شاعری میں یا تو ایک عجوبہ بن کر اس کا کوئی مقام ہی نہ ہوگا، اور تھوڑی سی ترقی اور اصلاح کے بعد، اگر ہوگا، تو صرف درجہ اول میں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ ابتدائی دور کے کلام میں غالب کی دور از کار تشبیہات پر پیچ تخیل، فارسی ترکیبوں کی بہتات اور محض خیالی مضامین نے ان کے بہت سے اشعار کو معمے اور پہیلیاں بنا دی ہیں لیکن اس سلسلے میں بھی غالب جتنا بدنام ہیں اتنے قصور وار نہیں ہیں۔ نسخہ بھوپالی میں غزلیات کے ۱۸۰۲ اشعار ہیں لیکن ان میں سے شاید صرف چار یا پانچ سو ہی ایسے نکلیں جن پر بہت مشکل یا مغلق ہونے کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کی ابتدائی مشکل پسندی کو بہکنے یا بھٹکنے سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اسے صرف ان کی "تلاش اور طلب کا ایک ارتقائی دور" سمجھا جا سکتا ہے۔

غالب نے ایک خط میں لکھا ہے کہ :-

"قبلہ! ابتدائے فکر سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین

خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہوگیا۔ آخر جب
تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا، اوراق یک قلم چاک کئے
دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رہنے دیے"
یہ خط اپنے کلام کا انتخاب کرنے کی ایک مدت کے بعد غالب نے لکھا تھا
لہٰذا ان کی یادداشت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ انھوں نے پورے دیوان
کو چاک نہیں کیا تھا بلکہ اس کے صرف وہ اشعار قلم زد کئے تھے جو بیدل
اسیر اور شوکت بخاری کے طرز پر تھے اور ایسے صرف دس پندرہ اشعار
متداول دیوان میں نمونے کے طور پہ باقی رہنے دیئے تھے۔ اس کے علاوہ
انہوں نے سیکڑوں دیگر اشعار جو "مضامین خیالی" پر مبنی نہیں تھے خارج
نہیں کئے تھے اور متداول دیوان میں بجنسہٖ شامل کرلئے تھے۔
یہ خیال کہ غالب نے اپنے ابتدائی دور کے جن اشعار کو اپنے منتخب
دیوان سے خارج کردیا تھا وہ سب کے سب مشکل اور مغلق ہی تھے صحیح
نہیں ہے۔ نمونے کے طور پر دیوان سے نکالے ہوئے چند اشعار ملاحظہ
فرمائیے :۔

ع طاؤس در رکاب ہے ہر ذرہ آہ کا
یارب نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا

ع ہوں داغ نیم رنگیِ شام وصال یار
نورِ چراغ بزم سے جوشِ سحر ہے آج

ع ہم نے نشوٗ زخم جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی
گل ہوا ہے ایک زخم سینہ پہ خوا ہاں داد
تماشائے گلشن، تمنائے چیدن

بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم
دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا!

ے واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں
ہوں گرمیٔ نشاط تصور سے نغمہ سنج

ے میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں
نے سرو برگ آرزو نے رہ و رسم گفتگو

ے اے دل و جان خلق، تو ہم کو بھی آشنا سمجھ
نظر بہ نقص گدایاں کمال بے ادبی ہے

ے کہ خار خشک کو بھی دعوی چمن نسبی ہے
وصل میں دل انتظار طرفہ رکھتا ہے مگر

ے فتنہ تاراج تمنا کے لیئے در کار ہے
رشک ہے آسائش ارباب غفلت پر اسد

ے پیچ وتاب دل نصیب خاطر آگاہ ہے!
طاؤس خاک حسن نظر باز ہے مجھے

ے ہر ذرہ چشمک نگہ ناز ہے مجھے!
توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا

ے آسمان سے بادۂ گلفام گر برسا کرے
وامگاہ عجز میں سامان آسائش کہاں

ے پرفشانی بھی فریب خاطر آسودہ ہے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر

ے دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

نہ حیرت چشم ساقی کی نہ صحبت دور ساغر کی
مری محفل میں غالب گردش افلاک باقی ہے

وہ تشنہ سرشار تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بکیفیت ساغر نظر آ دے

اسد جاں نثر الطافے کہ ہنگام ہم آغوشی
زبان ہر سر مو حال دل پرسید نی جانے

چوبیس پچیس سال کی عمر میں جب کہ دوسرے شاعر اپنی شاعری شروع کرتے ہیں غالب اپنی شاعری کے ابتدائی منازل طے اور ایک ہزار سے زائد اشعار قلم زد کر کے اپنے دیوان کا انتخاب کر چکے تھے۔ ان میں خود اصلاحی اور اپنے فن میں انتہائی کمال تک پہونچ جانے کا جذبہ شروع ہی سے موجود تھا۔ ان کے طرز سخن میں جو تبدیلی ہوئی وہ ارتقائی ہے اور وہ خود انھیں کی انتھک تدریجی کاوشوں کا حاصل ہے۔ یہ خیال کہ یہ تبدیلی معترضوں کے طنز و استہزا، یا دوستوں کی نصیحت کا نتیجہ ہے غالب کے کردار اور ان کے فن کو غلط سمجھنا ہے۔ بہت ابتدائی کلام کا ایک شعر ہے

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسد
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا!

غالب کا عمل اسی پر رہا ہے۔ انھیں خود اپنے اوپر اور اپنی اردو شاعری کے اوپر بھروسہ نہ ہوتا تو دہلی کے اس زمانے کے شاعروں اور سخن فہموں کی محفل میں وہ بیس یا بائیس سال کی عمر میں اتنی خود اعتمادی سے یہ دعویٰ نہ کر سکتے۔

۷
جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

مولانا محمد حسین آزادؔ نے غالبؔ کے متداول دیوان اردو سے متعلق آبِ حیات میں لکھا ہے :۔

"سن رسیدہ اور معتبر بزرگوں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں غالبؔ کا دیوان بہت بڑا تھا۔ یہ منتخب ہے۔ مولوی فضلِ حق صاحب، مرزا خاں عرف مرزا خاں کوتوال شہر مرزا صاحب کے دلی دوست تھے .... انھوں نے اکثر غزلوں کو دیکھا تو مرزا صاحب کو سمجھایا کہ یہ اشعار عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں گے۔ مرزا نے کہا اتنا کچھ کہہ چکا اب تدارک کیا ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا خیر ہوا سو ہوا انتخاب کرو اور مشکل شعر نکال ڈالو۔ مرزا صاحب نے دیوان حوالے کر دیا۔ دونوں صاحبوں نے دیکھ کر انتخاب کیا وہ یہی دیوان ہے جو کہ آج ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔"

یہ روایت بالکل ہی بے سر و پا ہے۔ جن سن رسیدہ اور معتبر بزرگوں نے اس کو بیان کیا تھا ان کی آزادؔ نے کوئی نشاندہی کرنا مناسب نہیں سمجھا جیسے وہ ایک اہم ادبی واقعہ نہیں بلکہ چاندنی چوک کی کوئی اڑتی پڑتی خبر بیان کر رہے ہوں۔ غالبؔ کے دیگر ہم عصروں نے جو ان سے قریب تر تھے۔ بالاتفاق رائے یہی لکھا ہے کہ غالبؔ نے اپنے کلام کا خود ہی انتخاب کیا تھا، کسی کی فہمائش یا فرمائش پر نہیں بلکہ محض اپنے ذوقِ سلیم کی بنا پر۔ اپنے متداول دیوان کے دیباچے میں اور کئی خطوط میں غالبؔ نے متواتر

یہی لکھا ہے کہ میں نے اپنے کلام کا خود انتخاب کیا ہے۔ اس کے علاوہ نسخۂ بھوپال اور نسخۂ شیرانی کو دیکھنے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ یہ انتخاب سوائے مصنف کے کوئی دوسرا کر ہی نہیں سکتا تھا کیوں کہ انتخاب کے ساتھ بعض اشعار کی کبھی اصلاح کی گئی ہے اور یہ انتخاب اور اصلاح بار بار کی گئی ہے۔ لہٰذا اب اس بات کے متعلق کسی قسم کے شک و شبہے کی گنجائش ہی باقی نہیں رہ گئی ہے کہ غالب نے اپنے دیوان کا خود انتخاب کیا تھا اور اس سلسلے میں جو روایتیں رواج پا گئی ہیں وہ بالکل ہی بے بنیاد ہیں۔

اس کے علاوہ غالب کے متعلق یہ تصور کرنا کہ وہ اپنے کلام کا انتخاب کسی دوسرے کر دالتے ایک بالکل ہی لایعنی سی بات ہے۔ ایک حقیقی اور عظیم المرتبت فن کار کی طرح انھیں اپنے فن سے والہانہ عشق تھا۔ غالب کا سب سے بڑا پرستار خود غالب تھا۔ خود اپنے وقت میں غالب کو اپنی شاعری کی بدولت جو عزت اور شہرت حاصل ہوئی وہ کسی دوسرے شاعر کے حصے میں نہیں آئی لیکن ان کی نظر میں ان کے کلام کی جو قدر و منزلت ہونا چاہیے تھی اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوئی۔ پھر بھلا وہ اپنے اور اپنی شاعری کے درمیان کسی غیر کی مداخلت کیسے برداشت کر سکتے؟ اور اپنا اپنے سے بڑا سخن فہم وہ سمجھتے ہی کسے تھے؟ انھوں نے تو اپنے آپ کو ہمیشہ سب سے ممتاز اور منفرد سمجھا اور یہ محض تعلّی نہیں تھی بلکہ اپنے فن کا صحیح ناقدانہ شعور بھی تھا ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

غالبؔ کا غیر متداول کلام

ماہنامہ "آج کل" کے فروری ۶۷ء کے شمارے میں عبدالرشید صاحب نے اپنے مضمون "دیوانِ غالب کی دو قدیم شرحیں" کے آخر میں مجھے ایک بڑا پرخلوص اور دلچسپ مشورہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

" آخر میں مصنف نشاطِ غالب کی خدمت میں یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ غالب کے مطبوعہ دیوان کے علاوہ ان کے غیر متداول اشعار کی نشر و اشاعت اور ان کی تشریح و تائش میں اگر مزید کاوش فکر نہ فرمائیں گے تو غالب بلکہ اردو ادب پر ان کا احسان ہو گا۔ مرزا غالب نے اپنے ابتدائی کلام کا بیشتر حصہ جو بیدل کے طرز میں نہایت پیچیدہ اور بعید از فہم ہو گیا تھا اپنا دیوان مرتب کرتے وقت مسترد اور اپنے دیوان سے خارج کر دیا تھا۔ مطبوعہ دیوان کے دیباچہ میں مرزا نے اس غیر مطبوعہ کلام کے متعلق لکھا ہے۔

"ہرچہ جز این است از آں بندہ نشمارند" غالب کے اس اعلان کے بعد ان کے غیر متداول کلام کی تعریف و توصیف کرنا گویا یہ دعویٰ کرنا ہے کہ غالب کو خود اپنے اچھے کلام کی خبر نہ تھی۔"

جہاں تک غالب کے غیر متداول کلام کی نشر و اشاعت اور تشریح و ستائش کا تعلق ہے اس کے لئے مجھے مخصوص طور سے موردِ الزام قرار دینا، جب کہ میں نے آج تک سوائے چند منتخب غیر متداول اشعار کے مطالب بیان کرنے کی کوشش کے سوا کچھ بھی نہیں کیا ہے، مجھے غیر ضروری اور غیر معمولی اہمیت دینا ہے مفتی انوار الحق صاحب نے نسخۂ حمیدیہ جسے غالب کے غیر متداول کلام کا ذخیرہ کہنا چاہیئے شایع کیا۔ شیخ محمد اکرام صاحب نے اپنی مشہور کتاب "غالب نامہ" میں غیر متداول کلام کا انتخاب پیش کیا۔ مالک رام صاحب نے اپنے مرتب کردہ دیوان میں غیر متداول کلام کا انتخاب شامل کیا۔ جعفر علی خاں اثر صاحب نے اپنی کتاب مطالعہ غالب میں غیر متداول اشعار کا انتخاب اور اس کے بعض اشعار کی تشریح پیش کی۔ امتیاز علی عرشی صاحب نے سارے غیر متداول کلام کو جمع کرکے دیوانِ غالب (نسخہ عرشی) مرتب کیا۔ رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور اور احتشام حسین صاحب نے غالب پر اپنے تنقیدی مضامین میں اکثر جا بجا ان کے غیر متداول اشعار کے حوالے دئے ہیں۔ کہاں تک نام گناؤں دیوانِ غالب کے بیسیوں اڈیشنوں میں مختلف مرتبوں نے غیر متداول دیوان کے منتخب اشعار شایع کئے ہیں۔ عبدالباری آسی صاحب نے نسخۂ حمیدیہ کے پورے غیر متداول کلام کی شرح لکھ کر بہت مدت ہوئی شایع کرا دی تھی۔ پھر جب ایسے جلیل القدر حضرات کے نام سر فہرست نظر آ رہے ہوں تو صرف میرے لئے کوئی حکم امتناعی جاری کرنا ایک عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

اپنے خلاف یک طرفہ فیصلہ کئے جانے کے باوجود میرا خیال ہے کہ عبدالرشید

صاحب کا یہ مشورہ کہ غالب کے غیر متداول کلام کی نشر و اشاعت اور تشریح و ستائش نہ کی جانی چاہیئے صرف نیک نیتی اور غالب سے خوش عقیدگی پر مبنی ہے کیونکہ ان کی رائے میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ غالب کو خود اپنے اچھے کلام کی خبر نہ تھی ورنہ وہ خود اس کے قابل ستائش جزو کو اپنے منتخب دیوان میں کیوں نہ شامل کر لیتے؟ اور اس طور سے ان کے زاویہ نگاہ سے غالب کی سخن سنجی پر جو حرف آتا ہے وہ اس کو کسی طور سے گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

میں مودبانہ عرض کروں گا کہ یہ مفروضہ کہ کسی شاعر یا ادیب کا خود اپنی تخلیقات کا انتخاب ہمیشہ صحیح اور درست ہوتا ہے اور اس سلسلے میں حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے بالکل بے بنیاد ہے۔ اس کے متعلق بہت سے نقادانِ فن کے مقالے اور مقولے ہمارے پیش نظر ہیں۔ شاعر اور ادیب کی طرح ایکٹر بھی ایک فن کار ہوتا ہے جو اپنے کردار کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی کرتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ خود اپنی ایکٹنگ کے متعلق اتنی صحیح رائے قائم کر سکے جتنی کہ اس کے ناظرین۔ آل احمد سرور صاحب غالب کے بہت بڑے مداح ہیں۔ انہوں نے دیوانِ غالب (نسخہ عرشی) کی تقریب میں لکھا ہے اور بالکل صحیح لکھا ہے "غالب بڑے باشعور شاعر ہیں مگر وہ بھی اپنے بہترین اشعار کا انتخاب نہیں کر سکے ہیں۔ جس طرح نسخہ حمیدیہ کے سوڈیڑھ سو اشعار دیوان میں شامل ہونے سے رہ گئے اسی طرح انتخاب غالب (رام پور) میں بھی متعدد ایسے اشعار درج نہیں ہو سکے جنھوں نے غالب کو غالب بنایا" قریب قریب یہی شکایت شیخ محمد اکرام صاحب کو بھی ہے۔ چناں چہ غالب نامہ میں اس بات پر افسوس کیا ہے کہ غیر متداول کلام کے بعض بلند پایہ اشعار منتخب دیوان میں شامل ہونے سے رہ گئے۔

یہ سمجھنا کہ اگر کوئی شاعر یا ادیب اپنی تخلیقات کا صحیح انتخاب نہیں کر پاتا تو اس کی سخن سنجی پر حرف آ جاتا ہے محض ایک واہمہ ہے اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ کسی ادب پارے کی پسندیدگی یا ناپسندیدگی کے لئے کوئی میکانکی اصول یا معیار تو مقرر کیا نہیں جا سکتا اس کا تعلق ذوقِ سلیم اور وجدان سے ہوتا ہے جس کے پس پشت سیکڑوں محرکات غیر شعوری طور پر کارفرما ہوتے ہیں اور وہ بہت سے انسانوں میں کیا کسی دو میں بھی بالکل یکساں نہیں ہو سکتے بلکہ کسی ایک انسان میں بھی ہمہ وقت یکساں نہیں رہ سکتے۔ پھر ایسی صورت میں اگر کوئی شخص کسی شاعر کے متعلق یہ کہہ دے کہ اس نے اپنے منتخب کلام میں اپنے کچھ اچھے اشعار چھوڑ دیئے یا ان سے کم تر حیثیت کے اشعار شامل کر لئے اور اس قسم کے اشعار کی تعداد بھی بہت قلیل ہو، تو اس سے یقیناً اس کے شاعرانہ مرتبے اور حیثیت کو کوئی صدمہ نہیں پہونچتا ہے۔

مثال کے طور پر غالب کے خطوط ہی کے متعلق ملاحظہ کیجئے پہلے پہل جب ان کے ایک قدر دان نے ان سے فرمائش کی تھی کہ آپ انھیں جمع کر کے چھپوا دیجئے تو غالب نہ صرف راضی نہیں ہوئے تھے بلکہ برا مان کر جواب دیا تھا کہ ان کی اشاعت سے میرے 'شکوہ سخنوری' کو صدمہ پہنچنے کا احتمال ہے۔ لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کے یہ نجی خطوط جو کسی خاص فکر اور توجہ کے بغیر قلم برداشتہ لکھے گئے تھے، اردو ادب پر ایک بہارِ بے خزاں بن کر چھا گئے ہیں غالب اگر ان خطوط کے علاوہ اور کچھ بھی نہ چھوڑتے تب بھی صرف ان کی وجہ سے وہ ایک قابلِ رشک ادبی حیثیت کے مالک ہوتے۔

شیخ محمد اکرام صاحب غالب کے فارسی کلام کے متعلق یوں رقمطراز ہیں :۔ "مرزا کو اپنے فارسی قصائد اور نثر پر بے انتہا ناز تھا اور فارسی غزل گوئی میں بھی وہ خواجہ حافظ کو خاطر میں نہ لاتے تھے لیکن باوجودیکہ ہم مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت مانتے ہیں۔ مرزا اسے جس قدر بلند پایہ سمجھتے تھے اس سے متفق ہونا کسی طرح ممکن نہیں اور اس کے متعلق جو کچھ مرزا کے معاصرین مثلاً نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مولانا صدرالدین آزردہ، آبیخبر، نیّر وغیرہ کی رائے تھی وہی درست معلوم ہوتی ہے۔ مرزا کے فارسی کلام کو تو موجودہ زمانے میں بھی کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوا۔ ان کی شاعری کو جو بلند جگہ دی جاتی ہے وہ ان کے منتخب دیوان ریختہ کی وجہ سے ہے۔ حالانکہ خود غالب کی نظر میں ان کے فارسی کلام کے مقابلے میں اردو کلام کی جو اہمیت تھی وہ ان کے اس شعر سے ظاہر ہے۔

فارسی بین تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است"

غالب نہ صرف ایک عظیم المرتبت شاعر بلکہ ایک بلند پایہ سخن فہم اور سخن سنج بھی تھے۔ ان کی حقیقت پسندی اور دیدہ وری ہی کا یہ تقاضا تھا کہ انہوں نے طرز بیدل پر کہے ہوئے اپنے نومشقی کے کلام کا بہت بڑا حصہ جس میں شاعری کم اور صنعت گری زیادہ تھی اپنے منتخب کلام سے نہ صرف یک قلم خارج کر دیا تھا بلکہ آئندہ کے لئے اپنے طرز سخن میں بھی اپنی ایک دوسری منفرد روش اختیار کر لی تھی۔ ان قلم زدہ اشعار میں سے بیشتر کا کوئی پیوند غالب کے منتخب اور مقبول عام اشعار سے نہیں لگ سکتا تھا۔ لہٰذا ان کا خارج کیا جانا ہی بہتر اور مناسب تھا بلکہ سچ پوچھئے تو اس خس و خاشاک کے دور ہو جانے سے

غالب کے منتخب کلام کے گل و بوٹے اور بھی زیادہ نمایاں اور دیدہ زیب ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کہہ چکنے کے بعد اگر دبی زبان سے یہ بھی کہہ دیا جائے کہ ان خارج شدہ اشعار میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی حیثیت سے غالبؔ کے منتخب کلام سے کم نہیں ہیں۔ بلکہ اکثر سے بہتر ہیں تو اسے غالبؔ کی شان میں گستاخی نہ سمجھنا چاہیئے ثبوت کے طور پر منتخب کلام اور غیر متداول کلام سے صرف چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

منتخب کلام:۔

ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دِل سے جگر جدا تھا

پینس پہ گذرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

اسدؔ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اُس نے ذرا میرے پاؤں داب تو دے

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں

غیر متداول کلام

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا
آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

دیر و حرم آئینۂ تکرار تمنا
واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا گنہ گار ہیں ہم!

طاؤس خاک حسن نظر باز ہے مجھے
ہر ذرہ چشمک نگہ ناز ہے مجھے

وہ تشنۂ سرشار تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بکیفیت ساغر نظر آ دے

مولانا حالی سے بڑا غالب کا کون مداح ہوگا بلکہ سچ پوچھیے تو ان کی یادگار غالب" کا غالب کو غالب بنانے میں سب سے زیادہ ہاتھ رہا ہے۔ وہ بھی غالب کے انتخاب کلام سے پوری طرح مطمئن نہیں تھے چنانچہ فرمایا ہے کہ دیوان میں کچھ ایسے اشعار بھی رہ گئے ہیں کہ اگر نکل جاتے تو بہت اچھا ہوتا اور اگر یہ رائے بعد از وقت نہ ہوتی اور غالب کو اس پر عمل کرنے کا موقع مل جاتا تو

غالب کا دیوان بے مثل اور بے نظیر ہوتا۔ مولانا حالی کا یہ مشورہ بہت پرخلوص اور معقول تھا لیکن چونکہ حالی کے سامنے غالب کا وہ پورا کلام موجود نہ تھا جو ان کی وفات کے بعد منظر شہود پر آیا لہٰذا ان کا مشورہ صرف نصف صداقت کا حامل رہ گیا ہے کچھ اشعار نکال دیئے جانے کے ساتھ ہی ساتھ کچھ چنے ہوئے غیر متداول اشعار کے شامل کئے جانے کی بھی ضرورت تھی۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی بھی کسی قطعی حکم لگانے کا ہرگز مجاز نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اب یہ بحث لا حاصل بھی ہے کہ غالب کے منتخب دیوان میں کون سے اشعار شامل ہونے چاہئیں تھے اور کون سے نہیں۔ متداول کلام کے ساتھ غیر متداول کلام بھی منظر عام پر آچکا ہے اور شائقین اپنے ذوق اور پسند کے مطابق ان اشعار کے انتخاب سے خود لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

آخر میں ایک بات میں اور بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ غالب نے جن اشعار کو اپنے منتخب دیوان میں شامل کرنا گوارا نہیں کیا ان کے متعلق یہ سمجھ بیٹھنا کہ وہ غالب کو ناپسند تھے یا ان کو وہ اپنے منتخب اشعار سے کم تر حیثیت کا سمجھتے تھے ایک بہت بڑی غلط فہمی ہوگی۔ انتخاب کرتے وقت غالب کے سامنے اپنی پسند کے علاوہ سب سے بڑا معیار اپنے زمانے کا مذاق شاعری بھی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے بعض جواہر پاروں کو وہ بادلِ ناخواستہ اس وجہ سے بھی خارج کرنے پر مجبور ہوتے ہوں کہ ان کے اس وقت خاطر خواہ پرکھنے والے نہ موجود ہوں یا وہ اس دور کے مروجہ لوازم شاعری سے میل نہ کھاتے ہوں یا ان کے موضوعات کو اس عہد میں قبولیت حاصل نہیں تھی کچھ اشعار غالب نے یقیناً اس خیال سے بھی قلم زد کر دیئے تھے کہ وہ ان کے مضامین کو فارسی میں بھی نظم کر چکے تھے۔ اس کے علاوہ ہم اس

امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے کہ اپنے کلام کا انتخاب کرتے وقت غالب کے بعض اشعار ان کے پیش نظر نہیں بھی تھے۔

جہاں تک غالب کے اس مقولے کا تعلق ہے کہ میرے منتخب دیوان میں جو اشعار شامل نہیں ہیں وہ مجھ سے منسوب نہ کئے جائیں تو اس کا صحیح مفہوم ان کے کردار کے پس منظر میں آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے وہ عمومیت سے گریزاں اور اپنا شمار عام شاعروں میں کرانے کو سخت معیوب سمجھتے۔ انہوں نے محض اپنے اس اندیشے کا تدارک کرنا چاہا تھا کہ کہیں ان کے بعد ان کے بعض نادان دوست جوش عقیدت میں عام مذاق کے بعض ادنیٰ اشعار بھی ان کے نام سے منسوب کرنے کی کوشش نہ کر بیٹھیں۔ اور درحقیقت غالب کا یہ اندیشہ ایک حد تک درست بھی تھا۔ کئی حضرات ایسی مذموم حرکتیں کر بھی چکے ہیں۔ اس کی ایک واضح مثال ہمارے سامنے ہے۔ مولانا عبدالباری آسی نے کئی غزلیں خود کہہ کر غالب کے نام سے منسوب کر دی تھیں اور وہ ایک عرصے تک انہیں کے نام سے شائع ہوتی رہیں اس سازش کا پتا ابھی حال میں چلا ہے۔

مراد میدن گل در گماں فگند امروز
کہ باز بر سر شاخ گل آشیانم سوخت

غالب ـــ ایک جائزہ

کیا فارسی کیا اردو، کیا نثر، کیا نظم؟ غالب کی طرف سے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے ؎

ہزار معنی، سرجوش خاص نطق من است
کز اہل ذوق دل، وگوئے از عسل بربست

فارسی سے انہیں خاص مناسبت اور فطری لگاؤ تھا اور اس کے رموز و نکات ان کے ذہن میں ایسے رچے ہوئے تھے جیسے بقول خود: "فولاد میں جوہر" انہیں فارسی میں اپنی "قادر الکلامی اور جولانیٔ طبع دکھانے" کا جو میدان میسر تھا وہ اردو میں ہرگز نہیں تھا۔ لیکن اب فارسی میں انہیں سمجھنے اور داد سخن دینے والے ہمارے درمیان کہاں؟ بس یوں سمجھ لیجئے کہ جب اردو کہ جس نے اسی دیش میں جنم لیا، یہیں پلی، بڑھی، پروان چڑھی اور یہیں جوان ہوئی جس نے اپنی گل افشانیٔ گفتار سے ہر چھوٹے بڑے کا دل موہ لیا، اور جو نہ صرف ایک جیتی جاگتی دل آویز زبان بلکہ بذات خود ایک ایسی تہذیب بھی ہے کہ جس کے قومی یک جہتی کے سنگم پر گوترا اور گنگا کے دھارے شیر و شکر ہو کر ملتے ہیں، ہمارے ملک میں پڑھنے والے اور جاننے والے کم سے کم تر ہوتے چلے جا رہے ہیں، تو پھر فارسی کا ذکر ہی کیا؟ لہٰذا بصورت موجودہ غالب کے فارسی میں وہ "نقشہائے رنگا رنگ"، جن میں انہوں نے اپنے خون جگر سے رنگ آمیزی کی تھی، ہماری نظروں سے قریب قریب اوجھل

ہیں اور ہم غالب کی صحیح ادبی حیثیت متعین کرنے سے بڑی حد تک قاصر ہیں۔

اردو میں غیر متداول کلام کو چھوڑ کر دے کر غالب کا ایک بہت مختصر متداول دیوان ہے اور کچھ نجی خطوط جو انہوں نے اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کو قلم برداشتہ لکھے تھے اور جن کو لکھتے وقت ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان کی اشاعت کی بھی کبھی نوبت آ سکتی ہے۔

اپنے ابتدائی دور میں اردو کلام کے متعلق غالب نے ذوق کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

۵ فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگزار از مجموعۂ اردو کہ بے رنگ من است

اور اپنے نجی خطوط کے متعلق ایک دفعہ ارشاد فرمایا تھا کہ ان کی اشاعت سے میرے "شکوہ سخنوری" کو صدمہ پہونچ جانے کا احتمال ہے۔ ان خطوط کی نقلیں اپنے پاس رکھنے کا انہیں کبھی خیال ہی نہیں پیدا ہوا اور ان کا بہت بڑا حصہ خود غالب کی زندگی میں تلف بھی ہو چکا تھا۔

لیکن یہی بچا کھچا مالِ غنیمت جو اردو کے ہاتھ لگا اس کے لیے ہفت اقلیم کے خزانوں سے کم گراں قدر ثابت نہیں ہوا۔ بے رنگ مجموعۂ اردو، ساری فضا کو رنگینیوں سے معمور کر کے اردو شاعری کے چمن پہ ایک بہار بے خزاں بن کر چھا گیا۔ کوئی ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کے اس قول میں کہ۔ "ہندستان کی الہامی کتابیں دو ہیں مقدس وید اور دیوانِ غالب" ان کا ہم نوا ہو یا نہ ہو یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ دیوان غالب سے زیادہ عہد آفریں صحیفہ کم سے کم اردو میں اور کوئی نظر نہیں آتا۔ غالب کے بعد آنے والی نسلوں کو اس نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے اور اس کا

ایک ادبی ثبوت یہ ہے کہ جتنا اس مقابلتاً مختصر دیوان پر لکھا گیا ہے اتنا اردو کی کسی دوسری ادبی کتاب پر نہیں، بلکہ شاید یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ اردو کے تمام غزل گو شاعروں پر مجموعی طور سے بھی اس قدر کتابیں اور مضامین نہیں ملتے ہیں جس قدر کہ تنہا غالب پر۔ غالب کے بعد اگر کسی شاعر پر لکھا گیا ہے تو علامہ اقبال پر جو ایک مبلغ اور بامقصد شاعر تھے لیکن طرز بیان کی حیرت انگیز مماثلت کے باوجود دونوں کی شاعری کے میدان بہت مختلف تھے۔

اور غالب کے انہیں نجی خطوط نے جنہیں وہ کبھی اپنے شکوہ سخنوری کے منافی سمجھتے ایک ایسے طرز نگارش کی بنیاد رکھی کہ جس سے اردو کی نثر جدید کی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے ان خطوط نے اردو نثر کو بے جا تصنع اور تکلف، فارسی کی نقل اور پرپیچ عبارت آرائی کے طلسم سے آزاد کر کے طوطا مینا، جن اور پری، شہزادوں اور درویشوں کی زبان کے بجائے ہم عام انسانوں کے بولنے اور لکھنے کی زبان بنانے کے سلسلے میں جو خدمت انجام دی ہے اس کے پیش نظر نقادان ادب کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ شاعر غالب بڑا ہے یا انشا پرداز غالب۔ مزاح اور بے تکلفی کی چاشنی میں ڈوبے ہوئے اپنی بے ساختگی، لطف بیان اور خلوص اظہار کے لئے یہ خطوط اب بھی یکتا اور بے مثل سمجھے جاتے ہیں اور بڑے بڑے صاحب طرز اور سحر نگار ادیب اور انشا پردازان کے طرز کی نقل کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے رہے ہیں۔ اردو نظم و نثر کا کوئی انتخاب اٹھا کر ملاحظہ کر لیجیے۔ صرف غالب ہی ایک ایسا شاعر اور ادیب ہے جو دونوں اصناف سخن میں ایک ہی شان سے صف اول میں جلوہ گر نظر آئے گا۔ اور اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں شاید ہی کسی کو تامل ہو کہ شاعرانہ نثر نگار کی مجموعی حیثیت سے غالب اردو ادب

کی سب سے بڑی شخصیت ہے۔

غالب کی عظمت اور اس کی بنا پر اس کی ہمہ گیر مقبولیت کی بنیاد صرف اس پر نہیں ہے کہ اس نے ہمارے لئے بہت سے ادبی جواہر پارے چھوڑے ہیں یا اس نے تخیل کی نادرہ کاری، جذبات کی شدت، نظر کی گہرائی، مشاہدے کی جدّت، افکار کی بلندی اور ساتھ ہی ساتھ طرز ادا کی ندرت اور حسن بیان کی لطافت کے بہت اعلیٰ اور ارفع شاہکار پیش کئے ہیں بلکہ غالب کے غالب بننے کا اصلی راز یہ ہے کہ اس نے اپنے بعد میں آنے والی نسلوں کو ایک نیا انداز فکر ایک جدید رجحان اور ایک ترقی پسند شعور بخشا ہے۔ غالب شاہ راہ ادب کا ایک سنگ میل نہیں جو صرف کسی مخصوص منزل کی نشاندہی کرتا ہے بلکہ روشنی کا ایک مینارہ ہے جو اپنی ضیا پاشیوں سے مختلف سمتوں کے راستوں کو منور کرتا ہے۔ وہ نہ خود کوئی منزل ہے نہ کسی منزل کا اشارہ بردار، لیکن اس کی روشنی سے اس کے پاس سے گذرنے والے فیضیاب ضرور ہوتے ہیں۔ اقبال اور جوش کے راستے ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں لیکن دونوں ہی غالب سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ اور اسی طرح دور جدید کے بہت سے مشہور اور مقبول عام شعرا کے کلام میں غالب کا بڑا چوکھا رنگ نظر آتا ہے۔

غالب ہمیں ہر بات کو عام دیکھنے والوں سے ہٹ کر ایک جداگانہ زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ روایت سے بغاوت کا راستہ دکھاتا ہے۔ وہ اگر ایک طرف آسمان کے تارے چھو لینے کے لئے اکساتا ہے تو دوسری طرف زمین پر مضبوطی سے قدم جمائے رکھنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ روایت کی پابندی میں اس کے یہاں کبھی غم جاناں کا ٹرا

رونا ہے لیکن وہ اس سیلاب میں بہہ نہیں جاتا۔ اس کا غم جاناں، غم دوراں کا صرف ایک جزو ہے۔ اس کی زندگی ایک جبر مشیت اور غم لازوال ہے۔ لیکن وہ اس سے بھی لطف اندوز ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی شب غم تاریک سے تاریک تر ہے لیکن وہ اس کے 'خندۂ دل' اور نشاط تصور' کے چراغوں کے درمیان اپنا دامن سمیٹے ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ مذہب کے قیود اور رسم سے وہ متنفر ہے واعظ اور زاہد سے اس کی پشتینی لڑائی ہے۔ ساری کائنات میں وہ صرف ایک ذات گرامی کا جلوہ دیکھتا ہے مگر وہ اس کے حضور میں بھی آشکیاب۔ طنز اور شوخی سے باز نہیں آتا۔ وہ بیک وقت بت تراش بھی ہے اور بت شکن بھی۔ وہ روایتی شاعری کی بڑی دیدہ زیب قبا پہن کر سامنے آتا ہے لیکن اگر ہم قریب سے دیکھیں تو اس کی آزاد خیالی کے ہاتھوں اس کے جسم پر یہ قبا جگہ جگہ سے چاک بھی نظر آتی ہے۔ وہ زندگی ہی کی طرح سیدھا بھی ہے اور پرپیچ بھی، قدامت پرست بھی ہے اور انقلاب پسند بھی، غیر ضروری طور سے سنجیدہ بھی ہے اور ضرورت سے زیادہ شوخ بھی بے مقصد بھی ہے اور خود ہی اپنا مقصد بھی۔ اس کی بزلہ سنجی اور مزاح کا لطیف حس جو اسے دوسروں پر کیا خود اپنے آپ پر ہنسنے اور منہ چڑانے پر مجبور کر دیتا ہے ہمیں کارزار حیات میں خود اعتمادی اور بالغ نظری کا ایک نیا احساس اور ولولہ عطا کرتا ہے۔ اور پھر اس پر طرہ یہ کہ اس کا انداز بیان ایسا دل فریب اور پرکشش ہے کہ اس کے منہ سے نکلی ہوئی معمولی سے معمولی بات پایۂ سحر و اعجاز کو پہونچ جاتی ہے۔ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

غالب کی تعریف اور توصیف کرنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ان کا کلام پستیوں سے بالکل ہی مبرا ہے یا انہوں نے ادنیٰ اشعار نہیں کہے ہیں یا انہوں نے تمام ممکن موضوعات سخن کو اپنا لیا تھا یا انہوں نے جس مضمون پر شعر کہا ہے سب شعرا سے بہتر کہا ہے یا انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ حرف آخر کا درجہ رکھتا ہے اور اس سے بہتر نہ کہا گیا ہے نہ کہا جا سکتا ہے۔ ایسا خیال بھی کرنا نہ صرف غلط بلکہ مضحکہ خیز ہو گا۔ عقیدت مندی کے جوش میں حقیقت پسندی کا ہوش ضرور باقی رہنا چاہیے۔ البتہ خواہ وہ غالب ہو یا کوئی بھی دوسرا شاعر، اس کے مرتبے کے تعین کے لئے پہلے اس کے بہترین کلام کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے بلند پایۂ اوسط درجے اور پست قسم کے کلام کا تناسب کیا ہے۔ غالب کے کلام کا معتد بہ حصہ بلند پایہ ہے اوسط درجے کا کلام اس سے کچھ ہی زیادہ ہو گا اور پست قسم کا کلام کم بلکہ بہت ہی کم ہے حتیٰ کہ دو تین فیصدی بھی نہیں ہو گا۔ اور اس معیار پر غالب اور اقبال کے علاوہ بہت ہی کم دوسرے شعرا پورے اتر سکیں گے۔

غالب کے کلام کو تین مفروضہ اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم میں ان کی بیدلانہ شاعری ہے۔ یہ نہ صرف فارسی ترکیبات سے گراں بار ہے بلکہ معنوی حیثیت سے بھی مشکل اور پیچیدہ ہے۔ یہ دل کی نہیں دماغ کی شاعری ہے۔ اس میں قادر الکلامی اور پرواز تخیل زیادہ اور لطف اور بے ساختگی کم ہے۔ یہ ان کی نوعمری کی تجرباتی شاعری تھی۔ اس سے ان کی منفرد طبیعت، غیر معمولی ذہانت اور قدرت اظہار کی فراوانی کا صاف پتا چلتا ہے اور اس میں بھی صنعت ایجاد، جوش نگاہ، اور نشاط تصور کی وہ سرشاریاں اور کرشمہ سازیاں کارفرما نظر آتی ہیں کہ پڑھنے والا حیرت زدہ رہ جاتا ہے چونکہ

اردو کی مروجہ شاعری سے اس کا پیوند نہیں ملتا تھا۔ لہذا غالب نے خود اس کلام کا بہت بڑا حصہ قلم زد کر کے اپنے متداول دیوان میں شامل نہیں کیا تھا

ان کے کلام کی دوسری قسم وہ ہے جس میں انہوں نے اپنے زمانے کے روایتی موضوعات سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ ان کے کلام کا سب سے بڑا حصہ ہے اور اسے ہم صرف اوسط درجے کی اچھی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ شاعری کی پامال شاہراہوں میں بھی اپنے منفرد زاویۂ نگاہ اور انداز بیان سے انہوں نے اپنے علاحدہ راستے نکالنے کی کوششیں کی ہیں تاہم یہ ان کی بہترین شاعری نہیں ہے۔ یہ ان کی جدت طرازی، ذاتی اپج اور فطری امنگ سے کچھ زیادہ میل نہیں کھاتی ہے۔ اس کلام میں ایک بہت قلیل جزو ایسا بھی ہے جو دوسروں کے لئے قابل قبول ہو تو ہو غالب کے شایانِ شان نظر نہیں آتا لہذا ہم اس کو ان کا پست کلام کہہ سکتے ہیں خوش قسمتی سے اس کی مقدار بہت حقیر ہے۔ اپنے اوسط درجے کے کلام میں بھی غالب کی انفرادیت بحیثیت شاعر اس کی اختراع پسندی اور جادو بیانی صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔

ان کے کلام کی تیسری اور اعلیٰ ترین قسم وہ ہے جس میں مضامین کی ندرت فکر کی ہمہ گیری، مزاج کی بے ساختگی، زبان کی لطافت اور بیان کی حلاوت میں وہ انتہائی کمال پر نظر آتے ہیں۔ اس کلام پر خود ان کا قول ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

حرف بحرف صادق آتا ہے۔ یہاں خواہ مسائل تصوف ہوں، خواہ رموز حیات، خواہ معاملہ بندی، خواہ حسن و عشق کی پرانی چھیڑ چھاڑ، خواہ

وصل ہو خواہ فراق، خواہ غم روزگار ہو خواہ نشاط زندگی، خواہ مشاہدات ہوں خواہ محسوسات اور خواہ صرف طرزادا اور لطف اظہار ہو غالب بیکراں اور بے پناہ نظر آتے ہیں۔ ایک ایک شعر پر کیا ایک ایک لفظ پر ان کی مہر ثبت ہے۔ مسلم الثبوت اساتذہ کے بیسیوں اشعار میں ان کا ایک شعر رکھ دیجئے اس کی شان نرالی دکھائی پڑے گی اور وہ خود بول اٹھے گا کہ میں غالب کے ذہن رسا کی پیداوار ہوں۔ اسی کلام نے غالب کو غالب بنایا ہے اور یہ صرف اردو شاعری میں کیا دنیائے شاعری میں بلند سے بلند مقام پانے کا مستحق ہے اور اسی کے لئے انہوں نے بالکل بجا طور سے کہا ہے ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

میں سخن فہم تو خیر کیا شاید غالب کا طرفدار کہا جا سکتا ہوں۔ لیکن آخر یہ طرفداری بھی کیوں ہے ع کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ میں غالب پرستی کے فیشن میں نہیں غالب کو اپنی بساط بھر سمجھنے کی کوشش کر کے اس کا طرفدار بنا ہوں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اندھی تقلید اور فیشن کی ریس سے میں اس قدر متنفر ہوں کہ جب میں نے زیادہ تر لوگوں کا رجحان غالب کی طرف دیکھا تو میں نے پہلے ان کے معترضین ہی کو پڑھنے کی کوشش کی۔ مجھے ان کے پاس سوائے اس کے کچھ نہیں ملا کہ غالب مشکل اور مغلق کہتے تھے (غالباً انہوں نے غالب کے مشکل اور مغلق اشعار کے رموز و نکات اور حسن معنی پر غور نہیں کیا یا پھر ان کے مقابلتاً آسان کلام کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا) یا غالب کے بعض اشعار مہمل

ہیں (غالب کا ایک شعر بھی مہمل نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ ابتدائی دور کے کلام میں جس کو انھوں نے قلمزد بھی کر دیا تھا بعض اشعار میں ان کے خیال اور زبان میں فن کارانہ ہم آہنگی نہ پیدا ہو سکی ہو) یا غالب کے یہاں بعض مقامات پر تعقید لفظی اور تنافر ہے اور اکثر انہوں نے کسی لفظ کو غلط معنی میں استعمال کیا ہے (ہو سکتا ہے کہ ایسا ہی ہو لیکن اس نے جو نئی ترکیبیں، تشبیہیں، خیالات کے نئے پیکر اور جدید الفاظ اور اسلوب اردو زبان کو بخش دیئے ہیں ان کے متعلق کیا خیال ہے ؟) یا غالب کے بعض اشعار محض لفظی بازی گری ہیں (اس کے علاوہ بھی غالب کے یہاں بہت کچھ ہے۔ الفاظ کسی خیال ہی کی ترجمانی کرتے ہیں اور اس خیال سے غزل کے موضوعات میں توسیع ہوتی ہے یا نہیں ؟ ") یا غالب گھما پھرا کر بات کرنے کے عادی تھے (اعتراض صحیح نہیں ہے۔ غالب نے پہلو دار اشعار ضرور کہے ہیں لیکن اس انداز سے کہ ان کا حسن دوبالا ہو گیا ہے) یا غالب نے اپنے پیش رو شعرا کے بعض اشعار کا چربہ اتارا ہے (اول تو ایسے اشعار کی، جن پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے تعداد ہی کتنی ہے اور پھر کیا یہ بات غالب کے لئے لائق ستائش نہیں ہے کہ اگر انہوں نے کسی عامتہ الورود یا پامال مضمون پر بھی طبع آزمائی کی ہے تو انہوں نے اس کو ترقی دے کر پہلے سے کہیں بہتر اور موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر صرف ایک موازنہ پیش کردوں گا۔ میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دم رخصت
کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

غالب کہتے ہیں ؎

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب
وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے)

بہرکیف یہ اعتراضات یا اسی قسم کے دوسرے، اگر وہ ایک حد تک درست بھی مان لئے جائیں تو بھی وہ اس نوعیت کے ہرگز نہیں ہیں کہ جن سے غالب کی عظمت کو کوئی ایسا صدمہ پہونچ جائے کہ جس کی وجہ سے ان کی شاعری کے مرتبے کے تعین کے لئے کسی نظر ثانی کرنے کی ضرورت محسوس کی جائے۔ غالب کے فوق البشر یا عقل کل ہونے کا دعویٰ نہ آج تک کسی نے کیا ہے اور نہ بقید ہوش و حواس کر ہی سکتا ہے۔ البتہ دبی زبان سے یہ ضرور کہا جا سکتا ہے غالب پر کئے ہوئے بہت سے اعتراضات سے غالب کا نہیں بلکہ خود ان کے معترضین کا بھرم کھل گیا ہے۔ کیا غالب کے علاوہ کسی دوسرے اردو شاعر کے کلام کا کبھی تجزیہ اس دیدہ ریزی اور نکتہ چینی سے کیا گیا ہے؟ اور اس کے بعد بھی غالب کے خلاف جو فرد جرم، مرتب ہو سکی ہے اس میں ہے کیا؟ میں تو اسے در پردہ غالب کی عظمت کا اقرار اور اعتراف سمجھتا ہوں۔

میری گذارش کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ غالب پر کوئی اعتراض کرنا کسی قسم کا جرم یا گناہ ہے۔ اعتراض خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ضرور کیا جانا چاہیئے۔ البتہ بقول شخصے پورے ہاتھی کو نظر میں رکھ کر نہ کہ صرف اس کی دُم، کان، یا سونڈ کو محض ٹٹول کر۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ غالب کی فرد گذاشتوں اور کوتاہیوں کو اجاگر کرنا ایک بہت اہم ادبی خدمت ہے لیکن صرف انہیں کو سب کچھ سمجھ کر غالب کی شاعری کے متعلق کوئی فیصلہ سنا دینا یقیناً ایک شدید قسم کی بد ذوقی اور ناانصافی ہوگی۔

مجھے حال ہی میں ایک مضمون پڑھ کر جس میں ایک صاحب نے غالب کو اہلِ دول کا خوشامدی، پیسے کا لالچی اور انگریزوں کا پٹھو وغیرہ لکھا ہے بہت افسوس ہوا۔ شاید مضمون نگار صاحب نے یہ تلخ اور ترش لہجہ اختیار کر کے اپنی رائے میں اپنی ترقی پسندی اور جدت نوازی کا ثبوت پیش کیا ہے لیکن واقعتاً اس سے ان کی نہ صرف بدمذاقی بلکہ تنگ نظری اور ناواقفیت ظاہر ہوتی ہے۔

ہیچ میدانی کہ غالب چوں بسر بردم بدہر
منکہ طبع بلبل و شغل سمندر داشتم

غالب نے بادشاہ ظفر، نواب رامپور، شاہ اودھ اور دیگر صاحبانِ منصب اور دولت کی شان میں قصیدے ضرور لکھے اور اس میں اپنے کمالِ فن کے اظہار کے ساتھ ہی ساتھ ان کی مبالغہ آمیز تعریف بھی کی ہے اور ان کے دستِ کرم سے بخشش بھی چاہی ہے۔ لیکن ایسا انہوں نے کن حالات میں کیا؟ اپنی خوشی سے کیا یا بدرجہ مجبوری؟ انیسویں صدی میں تو جاگیردارانہ نظام تھا ہی آج بیسویں صدی کے اس زمانے میں بھی جب جمہوریت اور سوشلزم کا کلمہ پڑھا جاتا ہے کیا ہمارے معاشرے کا یہ ایک اذیت ناک اور عبرت انگیز پہلو نہیں ہے کہ اہلِ قلم حضرات کو محض اپنے قلم کی کمائی سے اپنی روزی نصیب نہیں ہو پاتی۔ غالب کا ذریعہ معاش ان کی شاعری جب تک کہ اس کو اہلِ دول کی سرپرستی حاصل نہ ہوتی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ غالب سے زیادہ یہ خود معاشرے کی بدقسمتی تھی کہ ان کے جیسے عظیم المرتبت شاعر کو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑتا تھا۔ یہ کہنا تو آسان ہے کہ غالب اہلِ دول کی شان میں قصیدے نہ لکھتے بلکہ عزتِ نفس کے

سائقہ فاقے کر کر کے مر جاتے لیکن خود کہنے والے کی عزتِ نفس کے یہ کہاں تک شایانِ شان ہے کہ وہ اس معاشرے کو، جس میں اس کے عظیم سے عظیم فن کار کو اپنی گذر بسر کے لئے خوشامد اور چاپلوسی کرنا پڑتی ہو، تبدیل کرنے کی کوئی عملی جدو جہد کرنے کے بجائے صرف زبانی جمع خرچ پر قانع ہو جاتا ہے۔ غالب کے خطوط پڑھیئے اور دیکھیئے کہ آج جس بات کے لئے انھیں موردِ الزام گردانا جا رہا ہے اس کے کرنے میں وہ خود کس قدر کراہیت اور بے غرتی محسوس کرتے تھے۔ کسی کی مجبوری پر ہنسنا اور اس کا مذاق اڑانا عالی ظرفی کا ہرگز شیوہ نہیں ہے۔ آج تک شیکسپیر پر کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ اس نے ملکہ الیزبتھ اول کی مدح سرائی کیوں کی تھی؟ ؎

بلبل گلشن عشق آمدہ غالب زازل حیف گر زمزمہ مدح وثنا خیزد از او

غالب کو پیسے کا لالچی کہنا اور شاید محض اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنی پنشن کے اضافے اور پھر اس کی بازیابی کے لئے بڑی تگ و دو کی تھی نہ صرف زیادتی بلکہ ظلم ہے۔ انھیں پیسے کی لالچ ہوتی تو اتنے مصرف اور شاہ خرچ نہ ہوتے۔ اپنی مفلسی کے زمانے میں کبھی جب ان کو اپنے پہننے کے کپڑے تک فروخت کرنا پڑے تھے، انھوں نے محتاجوں اور ناداروں کی اعانت سے کبھی گریز نہیں کیا تھا۔ وہ ضرورت مند ہونے کے باعث پیسے کے متلاشی ضرور تھے لیکن اس کو صرف خرچ کرنے کے لئے۔ جوڑ کر جمع کرنے کے لئے ہرگز نہیں۔ اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے پیسے کی خواہش ایک بشری تقاضا ہے اور اگر اس کے لئے بھی غالب موجب عتاب قرار دیئے جانے لگیں تو ؎ ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اسے کیا کہئے

انگریزوں کے پٹھو ہونے کا غالب پر الزام نہ صرف الزام لگانے والے

کی ان کے کردار سے عدم واقفیت بلکہ اس کے انیسویں صدی کے سماجی اور سیاسی شعور سے بے بہرہ ہونے کی ایک واضح دلیل ہے۔ غالب کے زمانے میں ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے ملک میں انگریزوں کا تسلط ہو چکا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کی حیثیت محض ایک وظیفہ خوار کی تھی۔ دیسی ریاستوں میں قریب قریب طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی اور وہ باہمی رقابتوں اور اندرونی سازشوں کا شکار تھیں۔ اس پس منظر میں انگریزی حکومت ہی ایک مضبوط مرکزی طاقت کا نظام پیش کرتی۔ قومی یک جہتی، آزادی یا جمہوریت کا وہ تصور جو آج کل ہم لوگوں کے سامنے ہے، قریب قریب ناپید تھا۔ غالب اپنی پنشن کے سلسلے میں انگریزی حکومت کے دست نگر بھی تھے۔ وہ امن و امان کے خواہاں ایک مرنجامرنج اور عیش کوش انسان تھے۔ وہ نہ کوئی انقلابی رہنما تھے اور نہ سیاسی مفکر اس لئے ان کے لئے انگریزی حکومت سے وفاداری ایک طرح سے ناگزیر ہی تھی۔ غدر ۱۸۵۷ء کی خونریزی، قتل و غارت گری، اور افراتفری نے غالب کو حد سے زیادہ متاثر کیا۔ ان کے سیکڑوں محسن، دوست، رشتہ دار قدردان، اور شاگرد کی جان، مال اور عزت خاک میں مل گئی۔ عالی شان حویلیوں میں رہنے والے بے گھر ہو گئے۔ شہر کے رؤسا دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ شہزادوں تک کو بے رحمی سے قتل، اور بادشاہ کو بڑی کس مپرسی کے عالم میں جلا وطن کر دیا گیا۔ غرض کہ پرانے معاشرے کی پوری بساط ہی الٹ گئی۔ بغاوت ناکامیاب رہی اور انگریزی کا تسلط بالکل ہی مکمل اور مستحکم ہو گیا۔ غالب چونکہ اس قیامت خیز انقلاب میں خود ہی مبتلا تھے لہٰذا ان کے لئے اس جنگ آزادی کا صحیح تاریخی تجزیہ کرنا قریب قریب ناممکن تھا ان کی رائے میں جو کچھ ہوا وہ بہت غلط ہوا۔ بالکل بیکار ہوا اور اس سے

سراسر نقصان پہونچا۔ اور انہوں نے اس کا مورد الزام ان لوگوں کو قرار دیا جنھوں نے بغاوت شروع کی تھی۔ جواب میں انگریزوں نے جو عبرت انگیز منتقمانہ کارروائی کی اس کا انھیں بڑا قلق ہوا اور اس کی وجہ سے وہ زندگی بھر انگاروں پر لوٹتے رہے لیکن اس کو انہوں نے نوشتہ تقدیر کی طرح اٹل جانا۔ ملک گیری کے لیے اس زمانے میں اس قسم کے مظالم اور انسانیت سوز حرکات آئے دن ہوتی رہتیں۔ بغاوت چونکہ مقابلتاً ایک زیادہ سنگین واقعہ تھا لہذا دوسری جانب سے اس کا ردعمل بھی غیر معمولی تھا۔ غالب کو اسے بادل ناخواستہ اسی انداز میں قبول کرنا پڑا تھا۔

۵ تاب لاتے ہی بنے گی، غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد غالب نے انگریزی حکومت سے وفاداری کا کوئی نیا ناتہ نہیں جوڑا تھا بلکہ جو پرانا سلسلہ چلا آرہا تھا اسی کو استوار رکھنے اور بغاوت سے اپنی بے تعلقی ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجاہدین آزادی، جن میں بہتوں کو پھانسی ہوئی بہتوں کی جائدادیں ضبط ہوئیں ان میں سے بھی بیشتر نے بغاوت سے اپنی بے تعلقی ہی ظاہر کی تھی حتی کہ بہادر شاہ ظفر تک نے کہا تھا کہ وہ باغیوں کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ پھر ایسی صورت میں صرف غالب کو مخصوص کرکے انگریزوں کا پٹھو کہنا سراسر ناانصافی ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے ابتدائی زمانے کی تجاویز ملاحظہ ہوں۔ ۱۹۲۹ء سے قبل اس تک نے تو مکمل آزادی کی تجویز منظور نہیں کی تھی۔

ان تمام معروضات کے بعد بھی اگر غالب کو اہل دول کا مدح سرا اور انگریزی حکومت کا وفادار سمجھ کر مورد الزام ہی قرار دیا جائے تو اس سے

ان کی شاعرانہ عظمت پہ کیا حرف آتا ہے؟ درحقیقت غالب اپنی نجی زندگی میں ایک انتہائی وسیع القلب، الوالعزم، یار باش ہمدرد، خلیق، دلچسپ، بزلہ سنج، اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ ان میں زندگی کی لطافتیں بدرجہ اتم پائی جاتیں، اپنی برتری کا غیر معمولی احساس رکھنے کے باوجود ان کے دل میں دوسروں کا درد تھا اور وہ اپنے ملنے والوں کے پرخلوص رفیق اور غمگسار تھے۔ ایک بڑے شاعر ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ ہر حیثیت سے ایک بڑے انسان بھی تھے۔ ان کی ان تمام خصوصیات کو بالائے طاق رکھ کر ان کی زندگی کے محض ایک گوشے کو بانس پر چڑھا کر انھیں مطعون اور بدنام کرنا، چاند پر خاک ڈالنے کے مترادف ہے۔

ع ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

غالب کو جن مصائب اور صبر آزما حالات سے دوچار ہونا پڑا تھا وہ یقیناً معمولی نہ تھے: بچپن میں یتیمی کا داغ۔ اعزا کی بے اعتنائیاں۔ وطن سے ترک سکونت۔ سات اولادوں کی موت، عارف کا غم، ابتدا میں کلام پر طنز و استہزا، پنشن کا تنازعہ، کلکتہ کا ادبی ہنگامہ، مفلسی اور ناداری، کلام کی اس کے شایان شان داد نہ ملنا۔ اہل دول کی سرد مہری، حادثہ اسیری۔ غدر کا انقلاب اور خوں ریزی۔ اعزا اور دوستوں پر مصائب، پنشن سے محرومی، قرض خواہوں کی یورش، مستقل بے چارگی اور بے اطمینانی ان سب پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اگر پھر یہ دیکھا جائے کہ زمانے کے مصائب سے مقابلہ کرنے کا کتنا حوصلہ، ناقدردانیوں کے درمیان اپنی اور اپنے فن کی آن بان قائم رکھنے کا کتنا ولولہ، اور محرومیوں اور مایوسیوں کے درمیان زندگی پر خود ہنسنے اور دوسروں کو ہنسانے کا کتنا شعور، ان میں پایا جاتا تھا تو ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ غالب ایک انسان کی حیثیت سے بھی کتنے عظیم تھے۔ ان کی شاعری پرکھنے کے لئے اگر ایک مفکر

دماغ کی ضرورت ہے تو ان کی شخصیت سمجھنے کے لئے بھی ایک دردمند دل کا ہونا لازمی ہے۔ خود کہا ہے۔

ع نظر فروز ادا ہا بدشمن ارزانی
بمن سپار اگر داغ سینہ تابے ہست

با بوئے تو جولاں سُبک خیزئِ شوقم
در کوئے تو مہماں گراں پائئِ خویشم

مندرجہ بالا مضامین میں سے آخری تین ایک تسلسل سے نہیں، بلکہ مختلف اوقات میں منفرد طور پر لکھے گئے تھے۔ اسی وجہ سے ان میں اکثر مقامات پر موضوعات اور خیالات کی تکرار ہو گئی ہے۔

انتخابِ کلام (غیر متداول)

(جن اشعار پر نمبر پڑے ہوئے ہیں انکے مطالب بعد میں درج کئے گئے ہیں)

بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار

یعنی یہ ہر ورق، ورقِ انتخاب ہے!

نسخہ حمیدیہ

(۲)

۱ تغافل بدگمانی، بلکہ میری سخت جانی سے — نگاہ بے حجاب ناز کو بیم گزند آیا!

---

۲ ہوئی جس کو بہار فرصت ہستی سے آگاہی — برنگ لالہ جام بادہ بر محمل پسند آیا

---

۳ تنگی رفیق رہ تھی، عدم یا وجود تھا — میرا سفر، بطالع چشم حسود تھا

۴ خور شبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسدؔ — سرتا قدم گزارش ذوق سجود تھا

---

۵ ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

۶ شب نظارہ پرور تھا خواب میں خیال اس کا — صبح موجۂ گل کو نقش بوریا پایا!

---

۷ ساغر جلوہ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک — شوق دیدار بلا آئینہ ساماں نکلا

شوخی رنگ حنا خون وفا سے کب تک — آخر اے عہد شکن تو بھی پشیماں نکلا

---

۸ وسعت رحمت حق دیکھ کہ بخشا جاوے — مجھ سا کافر کہ جو ممنون معاصی نہ ہوا

---

۹ واں ہجوم نغمہ ہائے ساز عشرت تھا اسدؔ — ناخن غم یاں سر تار نفس مضراب تھا

---

۱۰ جوش تکلیف تماشا، محشرستان نگاہ — فتنۂ خوابیدہ کو آئینہ مشت آب تھا

۱۱ بے خبر مت کہہ ہمیں بے درد خود بینی سے پوچھ — قلزم ذوق نظر میں آئینہ پایاب تھا

---

۱۲ بے دیکھائے اسدؔ افسردگی آہنگ تر — یاد آیا مے کہ ذوق صحبت احباب تھا

---

۱۳ اگر آسودگی ہے مدعائے رنج بے تابی — نثار گردش پیمانۂ مے روزگار اپنا

---

۱۴ اسدؔ وحشت پرست گوشۂ تنہائی دل ہوں — برنگ موجۂ مے خمیازۂ ساغر ہے رم میرا

---

۱۵ اسدؔ یہ عجز و بے سامانی فرعون توام ہے — جسے تو بندگی کہتا ہو دعویٰ ہے خدائی کا

---

۱۶ ہم نے وحشت کدۂ بزم جہاں میں جوں شمع — شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

کس کا خیال آئینہ انتظار تھا — ہر برگ گل کے پردے میں دل بیقرار تھا

---

۱۷ سراپا یک آئینہ دار شکستن — ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا

۱۸ بصورت تکلف، بمعنی تاسف — اسدؔ میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

اے وائے غفلت نگہ شوق! ورنہ یاں — ہر پارۂ سنگ، لخت دل کوہ طور تھا

شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر — پیمانہ رات ماہ کا لبریز نور تھا

ہر رنگ میں جلا اسدؔ فتنہ انتظار — پروانۂ تجلی شمع ظہور تھا

۱۹ بہار رنگ خون گل ہے ساماں اشکباری کا — جنون برق نشتر ہے رگ ابر بہاری کا

اسدؔ ساغر کش تسلیم ہو گردش سے گردوں کی — کہ ننگ فہم مستاں ہے گلہ بد روزگاری کا

۲۰ طاؤس در رکاب ہے ہر ذرہ آہ کا — یارب، نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا

۲۱ عزلت گزیں بزم ہیں واماندگان دید — مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا

۲۲ جیب نیاز عشق نشاں دار ناز ہے — آئینہ ہوں شکستن طرف کلاہ کا

خود پرستی سے رہے باہم دگر ناآشنا — بیکسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

۲۳ بے دماغی شکوہ سنج رشک ہم دیگر نہیں — یار تیرا جام مے، خمیازہ میرا آشنا

۲۴ ربط یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار — سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا

اے آہ میری خاطر وابستہ کے سوا — دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

---

۲۵ ذوق سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا — موج خمیازہ ہے ہر زخم نمایاں میرا

اسد خاک در میخانہ اب سر پر اڑاتا ہوں — گئے وہ دن کہ پانی جام مے کا تا بہ زانو تھا

بشغل انتظار مہوشاں در خلوت شب ہا — سر تار نظر ہے رشتۂ تسبیح کوکب ہا

۲۶ عیادت ہائے طعن آلود یاراں زہر قاتل ہے — رفوئے زخم کرتی ہے بہ نوک نیش عقرب ہا

---

۲۷ برہن شرم ہے با وصف شہرت اہتمام اسکا — نگیں میں جوں شرار سنگ ناپیدا ہے نام اسکا

۲۸ بامید نگاہ خاص ہوں محمل کش حسرت — مبادا ہو عناں گیر تغافل لطف عام اسکا

اسد سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر — کہ کشت خشک اسکا ابر بے پروا خرام اسکا

۲۹ شب کہ تھی کیفیت محفل بیاد روئے یار — ہر نظر داغ مے خال لب پیمانہ تھا

دیکھ اسکے ساعد سیمین و دست پر نگار — شاخ گل جلتی تھی مثل شمع گل پروانہ تھا

۳۰ شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا — غالبؔ ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا
شب تری تاثیرِ سحر شعلہ آوازے — تارِ شمع آہنگِ مضراب پر پروانہ تھا
۳۱ موسمِ گل میں مے گلگوں حلال میکشاں — عقدِ وصل دخت رز انگور کا ہر دانہ تھا

---

۳۲ یک گام بے خودی سے لوٹیں بہارِ صحرا — آغوشِ نقشِ پا میں کیجیے فشارِ صحرا
۳۳ دیوانگی اسدؔ کی حسرت کش طرب ہے — در سر ہوائے گلشن دل میں غبارِ صحرا

پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے — رنگ اڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا
اسدؔ اے ہرزہ درا، نالہ بغوغا تا چند — حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

اسدؔ اربابِ فطرت قدرداں لفظ و معنی ہیں — سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاقِ تحسین کا

---

۳۴ محتسب سے تنگ ہے از بسکہ کارِ میکشاں — رز میں جو انگور نکلا عقدۂ مشکل ہوا
عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسدؔ — نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

---

۳۵ ہے تنگ ز واماندہ شدن حوصلۂ پا — جو اشک گرا خاک میں ہے آبلۂ پا

---

۳۶ حیرت انداز رہبر ہے عناں گیر اے اسدؔ — نقشِ پائے خضریاں سدِ سکندر ہو گیا

---

۳۷ عروجِ ناامیدی چشمِ زخمِ چرخ کیا جانے — بہارِ بے خزاں از آہ بے تاثیر ہے پیدا

نہ پوچھ حال شب و روز ہجر کا غالب　　خیال زلف و رخ دوست صبح و شام رہا

بسنگ شیشہ توڑوں ساقیا پیمانہ پیماں　　اگر ابر سیہ مست از سوئے کہسار ہو پیدا

(ب)

شب کہ تھا نظارگی روئے بتاں کا اے اسد　　گر گیا بام فلک سے صبح طشت ماہتاب

---

۳۸ عمر میری ہو گئی صرف بہار حسن یار　　گردش رنگ چمن ہے ماہ و سال عندلیب
ہے مگر موقوف بر وقت دگر کار اسد　　اے شب پروانہ و روز وصال عندلیب

(ت)

نہ ادروں کی سنتا نہ کہتا ہوں اپنی　　سر خستہ و شور وحشت سلامت
نہ فکر سلامت نہ بیم ملامت　　ز خود در فتگیہائے حیرت سلامت
رہے غالب خستہ مغلوب گردوں　　یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت

(ث)

۳۹ ناخن دخل عزیزاں یک قلم ہے نقب زن　　پاسبانی طلسم گنج تنہائی عبث
۴۰ محمل پیمانۂ فرصت ہے بر دوش حباب　　دعوی دریا کشی و نشہ پیمائی عبث
۴۱ اے اسد بیجا ہے ناز سجدہ عرض نیاز　　عالم تسلیم میں یہ دعوی آرائی عبث

---

۴۲ ہوں داغ نیم رنگی شام وصال یار آج — نور چراغ بزم سے جوش سحر ہے آج

۴۳ تا صبح ہے بہ منزل مقصد رسیدنی — دود چراغ خانہ غبار سفر ہے آج

---

۴۴ سیر ملک حسن کر میخانہ ہا نذر خمار — چشم مست یار سے ہے گردن مینا پہ باج

(چ)

۴۵ خمار منت ساقی اگر یہی ہے اسدؔ — دل گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

---

۴۶ کس بات پہ مغرور ہے اے عجز تمنا — سامان دعا وحشت و تاثیر دعا ہیچ

(ح)

زندگانی نہیں بیش از نفس چند اسدؔ — غفلت آرائی یاراں پہ ہیں خنداں گل صبح

(د)

نوازشِ نفسِ آشنا کہاں؟ ورنہ — بہ رنگ نے ہے نہاں در ہر استخواں فریاد

۴۷ بجواب سنگ دلیہائے دشمناں ہمت — ز دست شیشہ دلیہائے دوستاں فریاد

ہزار آفت و یک جان بے نوائے اسدؔ — خدا کے واسطے اے شاہ بیکساں فریاد

---

۴۸ تھی نگہ میری نہاں خانہ دل کی نقاب — بے خطر جیتے ہیں ارباب ریا میرے بعد

تھا میں گلدستہ احباب کی بندش کی گیاہ — متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

---

۴۹ ہم نے سوزخمِ جگر پر بھی زباں پیدا کی — گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پہ خواہانِ داد

۵۰ بسکہ ہیں در پردہ مصروفِ سیہ کاری تمام — آستر ہے خرقۂ زاہد کا صوفِ مداد

---

۵۱ تو پست فطرت اور خیال بسا بلند — اے طفلِ خود معاملہ قد سے عصا بلند

ہو تو نہ کھینچئے یہ تکلف نگاریاں — ہوتا ہے ورنہ شعلۂ رنگِ حنا بلند

---

۵۲ چشمِ بے خون دل و دل تہی از جوشِ نگاہ — نہ زباں عرضِ فسونِ ہوسِ گل تا چند؟

۵۳ بزمِ داغِ طرب و باغ کشادِ پر رنگ — شمع و گل تا کئے و پروانہ و بلبل تا چند؟

اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام! — مشکل آساں کن یک خلق تغافل تا چند؟

(س)

مدعی میرے صفائے دل سے ہوتا ہے خجل — ہے تماشا زشت رویوں کا عتاب آئینے پر

---

۵۴ کبھی یاروں کی بدمستی نے میخانے کی پامالی — ہوئی قطرہ فشانیہائے مے باران سنگ آخر

---

۵۵ اے چرخ خاک برسرِ تعمیرِ کائنات — لیکن بنائے عہدِ وفا استوار تر

آئینہ داغِ حیرت شکنجِ یاس — سیماب بے قرار و اسد بے قرار تر

اسد کی طرح میری بھی بغیر از صبحِ رخسارہ — ہوئی شامِ جوانی اے دلِ حسرت نصیب آخر

ظلم کرنا گدائے عاشق پر — نہیں شاہانِ حسن کا دستور

دوستو مجھ ستم رسیدہ سے دشمنی ہے وصال کا ندکور
زندگانی پہ اعتماد غلط ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور

(ز)

۵۶ فریب صنعت ایجاد کا تماشا دیکھ نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز
۵۷ ہجوم فکر سے دل مثل موج لرزے ہے کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز

---

۵۸ آئی یک عمر سے معذور تماشا نرگس چشم شبنم میں نہ ٹوٹا مژۂ خار ہنوز

---

۵۹ حسن خود آرا کو ہے مشق تغافل ہنوز ہے کف مشاطہ میں آئینۂ گل ہنوز

---

۶۰ چاک گریباں کو ہے ربط تامل ہنوز غنچے میں دل تنگ ہے حوصلۂ گل ہنوز

گل کھلے غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی سرخوش خواب ہے وہ نرگس مخمور ہنوز

(س)

اے اسد ہم خود اسیر رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیاد ناداں ہے گرفتار ہوس

---

۶۱ حیرت سے ترے جلوے کی از لبکہ ہیں بیکار
خود قطرۂ شبنم میں ہے جوں شمع بفانوس

(غ)

ہوتے ہیں محو جلوۂ نور سے ستارگان دیکھ اسکو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

۶۲ کون آیا جو چمن بے تابِ استقبال ہے جنبشِ موجِ صبائے شوخیٔ رفتارِ باغ

(ف)

۶۳ بیش از نفس، بتاں کے کرم نے وفا نہ کی تھا محملِ نگاہ بدوشِ شرار حیف

خرمن بباد دادہ دعویٰ ہیں ہوس ہو ہم یک طرف ہیں برق شرر بیز یک طرف

۶۴ یک جانب لے اسد شبِ فرقت کا بیم ہے دامِ ہوس ہے زلف دل آویز یک طرف

(گ)

اے آرزو شہیدِ وفا خوں بہا نہ مانگ جز بہرِ دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ

۶۵ برہم ہے بزمِ غنچہ بیک جنبشِ نشاط کاشانہ بسکہ تنگ ہے غافل ہوا نہ مانگ

۶۶ میں دور گرد عرضِ رسومِ نیاز ہوں دشمن سمجھ ولے نگہ آشنا نہ مانگ

(ل)

نور سے تیرے ہے اس کی روشنی ورنہ ہے خورشید یک دستِ سوال

ناسازیٔ نصیب، درشتیٔ غم سے ہے امید ناامید و تمنا شکستہ دل

ہے سنگِ ظلمِ چرخ سے میخانے میں اسد صہبا فتادہ خاطر و مینا شکستہ دل

بیکسی افسردہ ہوں اے ناتوانی کیا کروں — جلوۂ خورشید سے ہے گرم پہلوئے ہلال

۶۷ شکوہ درد و درد داغ اے بے وفا معذور رکھ — خوں بہائے یک جہاں امید ہے تیرا خیال

---

۶۸ دیوانگاں کا چارہ فروغ بہار ہے — ہے شاخ گل میں پنجۂ خوباں بجائے گل

۶۹ مژگاں تلک رسائی لخت جگر کہاں — اے وائے گر نگاہ نہ ہو آشنائے گل

(م)

۷۰ تکلف آئینۂ دو جہاں مدارا ہے — سراغ یک نگہ قہر آشنا معلوم

۷۱ اسد فریفتۂ انتخاب طرز جفا — وگرنہ دلبری وعدۂ وفا معلوم

---

۷۲ ازانجا کہ حسرت کش یار ہیں ہم — رقیب تمنائے دیدار ہیں ہم

۷۳ رسیدن گل باغ واماندگی ہے — عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم

۷۴ تماشائے گلشن تمنائے چیدن — بہار آفرینا گنہگار ہیں ہم

۷۵ نہ ذوق گریباں نہ پروائے داماں — نگہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

۷۶ اسد شکوہ کفر و دعا ناسپاسی
ہجوم تمنا سے ناچار ہیں ہم

اے بال اضطراب کہاں تک فسردگی — یک پرزدن تپش میں ہے کار قفس تمام

(ن)

۷۷ جائے کہ پائے سیل بلا درمیاں نہیں — دیوانگاں کو واں ہوس خانماں نہیں

۷۸ گل غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے — اے آگہی فریب تماشا کہاں نہیں

---

۷۹ جنبش دل سے ہوئے ہیں عقدہائے کار وا — کم تریں مزدور سنگین دست ہے فرہادیاں

۸۰ ناگوار ہے ہمیں احسان صاحب دولتاں — ہے زر گل بھی نظر میں جوہر فولادیاں

قطرہ ہائے خون بسمل زیب داماں ہیں اسدؔ — ہے تماشا کردنی گل چینی جلادیاں

---

۸۱ دیدۂ حرم آئینۂ تکرار تمنا — واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں

---

۸۲ کیفیت دگیر ہے نثار دل خوں میں — اک غنچے سے صد ساغر گل رنگ نکالوں

---

۸۳ ہمہ چشم واکشادہ و گلشن نظر فریب — لیکن عبث کہ شبنم خورشید دیدہ ہوں

۸۴ پیدا نہیں ہے اصل تگ و تاز جستجو — مانند موج آب زبان بریدہ ہوں

۸۵ میں بے خبر کہ جوہر آئینہ تھا عبث — پائے نگاہ خلق میں خار خلیدہ ہوں

۸۶ ہوں گرمی نشاط تصور سے نغمہ سنج — میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

(ہم طرح اشعار کے لئے شعر ۱۸۵ اور متعلقہ اشعار ملاحظہ فرمائیے)

۱۸۵

۸۷ بہ وحشت گاہ امکاں اتفاق چشم مشکل ہے — مہ و خورشید باہم ساز یک خواب پریشاں ہیں

---

۸۸ سایۂ گل داغ و جوش نکہت گل موج دود — رنگ کی گرمی ہے تاراج چمن کی فکر میں

اے نوا ساز تماشا سر بکف جلتا ہوں میں — اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں

۸۹ چمن، نامحرمِ آگاہیِ دیدارِ خوباں ہے — سحر گلہائے نرگس چند چشمِ کور ملتے ہیں

---

۹۰ بے دماغی، حیلہ جوئے ترکِ تنہائی نہیں — ورنہ کیا موجِ نفس زنجیرِ رسوائی نہیں

۹۱ کس کو دوں یارب حسابِ ناکہہائے دل — آمد و رفتِ نفس، جز شعلہ پیمائی نہیں

---

۹۲ ہے طلسمِ دہر میں صد حشرِ پاداشِ عمل — آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

ہے وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت — عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

رنجشِ دل یک جہاں ویراں کر گئی اے فلک — وحشت ساماں ہے غبارِ خاطرِ آزردگان

۹۳ خار سے گل سینہ انگارِ جفا ہے اے اسدؔ — برگ ریزی ہے پرافشانیِ ناوک خوردگان

(و)

۹۴ وہ دل جوں شمع بہرِ دعوتِ نظارہ لایعنی
نگہ لبریزِ اشک و سینہ معمورِ تمنا ہو

۹۵ نہ دیکھیں روئے یک دل سرد، غیر از شمعِ کافوری
خدایا اس قدر بزمِ اسدؔ گرمِ تماشا ہو

ستم کشی کا، کیا دل نے حوصلہ پیدا — اب اس سے رابطہ کہ دل جو بہت ستم گر ہو

امیدوار ہوں تاثیرِ تلخ کامی سے — کہ قندِ بوسۂ شیریں لباں مکرر ہو

زلفِ خیالِ نازک و اظہار بے قرار | یا رب بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو
۹۶ واں پرفشاں دامِ نظر ہوں جہاں اسدؔ | صبحِ بہار بھی قفسِ رنگ و بو نہ ہو

---

۹۷ نہیں جز درد تسکیں کوشِ ایں بیدرداں | کہ موجِ گریہ میں صد خندہ دنداں نما گم ہو
۹۸ بلا گردانِ تمکینِ تباں صد موجہ گو ہر | عرق بھی حسن کے عارض پہ تکلیفِ حیا گم ہو
اٹھائے کب نہ وہ جان شرمِ تہمتِ قتلِ عاشق کی | کہ جیسے ہاتھ میں مانندِ خوں رنگِ حنا گم ہو

---

(۵)

۹۹ ہر داغِ تازہ یک دل داغ انتظار ہے | عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ
کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل | دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

---

۱۰۰ کوئی آگاہ نہیں باطن ہم دیگر سے | ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

---

۱۰۱ بسکہ مے پیتے ہیں ارباب فنا پوشیدہ | خطِ پیمانۂ مے ہے نفسِ دزدیدہ

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ | خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سمجھ
۱۰۲ گاہ بخلد امید وار گہ بجحیم بیم ناک | گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ
۱۰۳ اے بسرابِ حسن خلق تشنۂ سعی امتحاں | شوق کو منفعل نہ کر ناز کو التجا سمجھ
۱۰۴ شوخیِ حسن و عشق ہے آئینہ دار ہم دگر | خار کو بے نیام جان ہم کو برہنہ پا سمجھ

---

۱۰۵ نے سرو برگ آرزو، نے رہ و رسمِ گفتگو | اے دل و جانِ خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

(ی)

ہستی فریب نامۂ موج سراب ہے　　یک عمر نازِ شوخیِ عنواں اٹھائیے

مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے　　کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی

کرتے ہو شکوہ کس کا؟ تم اور بے وفائی　　سر پیٹتے ہیں اپنا، ہم اور نیک نامی
صد رنگ گل کترنا، در پردہ قتل کرنا　　تیغِ ادا نہیں ہے پابندِ بے نیامی
۱۰۶　ہر چند عمر گزری آزردگی میں لیکن　　ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی
ہے یاس میں اسد کو ساقی سے بھی فراغت　　دریا سے خشک گذری مستوں کی تشنہ کامی

نظر بہ نقصِ گدایاں کمالِ بے ادبی ہے　　کہ خارِ خشک کو بھی دعویِٰ چمن نسبی ہے
ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ　　لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے
۱۰۷　چمن میں کس کی یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تماشا　　کہ برگ برگِ سمن شیشہ ریزہ حلبی ہے

۱۰۸　بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار　　یعنی یہ ہر ورق ورقِ انتخاب ہے

تا چند پستِ فطرتیِ طبعِ آرزو؟　　یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے
یک بار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے　　اے جوشِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے

۱۰۹　کہوں کیا گرم جوشی میکشی میں شعلہ رویاں کی　　کہ شمعِ خانۂ دل آتشِ مے سے فروزاں کی

---

۱۱۰ غرورِ لطفِ ساقی نشۂ بے باکی مستاں — نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی

۱۱۱ ہوا ہے مانعِ عاشق نوازی نازِ خود بینی — تکلف برطرف آئینۂ تمیز حائل ہے

---

۱۱۲ ہوں گرفتارِ کمین گاہِ تغافل کہ جہاں — خوابِ صیاد سے پرواز گرانی مانگے

---

۱۱۳ باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے — کردیا ہے پا بزنجیرِ رمِ آہو مجھے

---

۱۱۴ سرورِ نشۂ گردش، اگر کیفیت افزا ہو — نہاں ہر گردبادِ دشت میں جامِ سفالی ہو

۱۱۵ عروجِ نشہ ہے سرتا قدم قدِ چمن رویاں — بجائے خود وگرنہ سرو بھی مینائے خالی ہو

ہوا آئینہ جامِ بادہ، عکسِ روئے گلگوں سے — نشانِ خالِ رخ داغِ شرابِ پرتگالی ہے

یہ ستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے — زمیں جوشِ طرب سے جامِ لبریزِ سفالی ہے

۱۱۶ اسدؔ مت رکھ تعجب خردماغیہائے منعم کا — کہ یہ نامرد بھی شیر افگنِ میدانِ قالی ہے

---

۱۱۷ داغ ہم دیگر ہیں اہلِ باغ، گر گل ہو شہید — لالہ چشمِ حسرت آلود چراغِ کشتہ ہے

وہ دیکھ کے حسن اپنا مغرور ہوا غالبؔ — صد جلوۂ آئینہ یک صبحِ جدائی ہے

حسرت سے دیکھ رہے ہیں ہم آب و رنگِ گل — مانندِ شبنم اشک ہیں مژگانِ خار کے

اسدؔ بند قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ — اگر وا ہو، تو دکھلادوں کہ یک عالم گلستاں ہے

۱۱۸ کجا مے کو عرق؟ سعی عروج نشہ رنگیں تر
خط رخسار ساقی تا خط ساغر چراغاں ہے

۱۱۹ تکلف ساز رسوائی ہے غافل شرم رعنائی
دلِ خوں گشتہ در دستِ حنا آلودہ عریاں ہے

۱۲۰ اسد جمعیت دل در کنار بے خودی خوشتر
دو عالم آگہی ساماں یک خواب پریشاں ہے

پیدا کریں دماغ تماشائے سرو و گل — حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے
ساقی، بہار موسم گل ہے سرور بخش — پیماں سے ہم گذر گئے پیمانہ چاہیے

---

۱۲۱ وقت اس افتادہ کا خوش، جو قناعت سے اسد
نقش پائے مور کو تخت سلیمانی کرے

---

۱۲۲ آتش افروزی یک شعلہ ایما تجھ سے — چشمک آرائی صد شہر چراغاں مجھ سے

اے سر شوریدہ! ذوق عشق و پاس آبرو
یک طرف سودا و یک سو منت دستار ہے

۱۲۳ وصل میں دل انتظار طرفہ رکھتا ہے مگر
فتنہ تاراج تمنا کے لئے درکار ہے

---

۱۲۴ تغافل مشربی سے ناتمامی بسکہ پیدا ہے — نگاہ ناز چشم یار میں زنار مینا ہے

۱۲۵ نگہ معمار حسرت ہا چہ آبادی چہ ویرانی — کہ مژگاں جس طرف وا ہو کف داماں صحرا ہے

---

۱۲۶ ہے بہار تیز رو گلگون نکہت پہ سوار — یک شکست رنگ گل صد جنبش مہمیز ہے

اسد بہار تماشائے گلستان حیات — وصال لالہ عذاران سرو قامت ہے

---

۱۲۷ خود فروشیہائے ہستی بسکہ جائے خندہ ہے — ہر شکست قیمت دل میں صدائے خندہ ہے

عرض سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ — صحرا کہاں کہ دعوت دریا کرے کوئی
وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے اسد — دکھلا کے اسکو آئینہ توڑا کرے کوئی

---

۱۲۸ میں ہوں اور حیرت جاوید مگر ذوق خیال — بہ فسون نگہ ناز ستاتا ہے مجھے

---

۱۲۹ لطف عشق ہر یک انداز دگر دکھلائیگا — بے تکلف یک نگاہ آشنا ہو جائیے

ہمارا دیکھنا گر ننگ ہے سیر گلستاں کر — شرار آہ سے موج صبا دامن گلچیں ہے
پیام تعزیت پیدا ہے انداز عیادت سے — شب ماتم تہہ داماں دود شمع بالیں ہے

بہار باغ پامال خرام جلوہ فرمایاں
حنا سے دست و خون کشتگاں سے تیغ رنگیں ہے

---

۱۳۰ منت کشی میں حوصلہ بے اختیار ہے — داماں صد کفن تہہ سنگ مزار ہے

۱۳۱ زنجیر یاد پڑتی ہے جادے کو دیکھ کر — اس چشم سے ہنوز نگہ یادگار ہے

برنگ شیشہ ہوں یک گوشۂ دل خالی — کبھی پری مری خلوت میں آنکلتی ہے

کس فرصت وصال پہ ہے گل کو عندلیب — زخم فراق خندہ بے جا کہیں جسے
یارب ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو — یہ محشر خیال کہ دنیا کہیں جسے

---

۱۳۲ کیا ہے ترک دنیا کاہلی سے — ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے
پرافشاں ہو گئے شعلے ہزاروں — رہے ہم داغ اپنی کاہلی سے

۱۳۳ خدا یعنی پدر سے مہرباں تر
پھرے ہم دربدر ناقابلی سے

---

۱۳۴ جنوں افسردہ و جاں ناتواں، اے جلوہ شوخی کر
گئی یک عمر خود داری باستقبال رعنائی

---

۱۳۵ رشک ہے آسائش ارباب غفلت پر اسدؔ
پیچ و تاب دل نصیب خاطر آگاہ ہے

---

۱۳۶ رچ گیا جوش صفائے زلف کا اعضا میں عکس — ہے نزاکت جلوہ اے ظالم سیہ فامی تری
برگ ریزیہائے گل ہی وضع زر افشاندنی — باج لیتی ہے گلستاں سے گل اندامی تری
ہم نشینی رقیباں، گرچہ ہے سامان رشک — لیکن اس سے ناگوارتر ہے بدنامی تری

بتخانے میں اسدؔ بھی بندہ تھا گاہے گاہے
حضرت چلے حرم کو اب آپ کا خدا ہے

---

۱۳۷ گردش میں لا تجلی، صد ساغر تسلی
چشم تحیر آغوش مخمور ہرا دا ہے

---

۱۳۸ چاہے گر جنت، جز آدم وارث آدم نہیں
شوخی ایمان زاہد سستی تدبیر ہے

موج تبسم لب آلودہ مستی
میرے لئے تو تیغ سیہ تاب ہو گئی
رخسار یار کی جو کھلی جلوہ گستری
زلف سیاہ بھی شب مہتاب ہو گئی
غالبؔ زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہر نایاب ہو گئی

---

۱۳۹ طاؤس خاک حسن نظر باز ہے مجھے
ہر ذرہ چشمک نگہ ناز ہے مجھے

---

۱۴۰ محیط دہر میں بالیدن از ہستی گزشتن ہے
کہ یاں ہر اک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

---

۱۴۱ خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدد جانے
وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے
۱۴۲ نفس بنالہ رقیب و نگہ باشک عدو
زیادہ اس سے گرفتار ہوں کہ تو جانے
۱۴۳ زباں سے عرض تمنائے خامشی معلوم
مگر وہ خانہ برانداز گفتگو جانے

---

۱۴۴ شوخی چشم حبیب فتنہ ایام ہے
قسمت بخت رقیب گردش صد جام ہے
گریۂ طوفاں رکاب نالہ محشر عناں
بے سروساماں اسدؔ فتنہ سرانجام ہے

صبح سے معلوم، آثار ظہور شام ہے — غافلاں آغاز کار آئینہ انجام ہے

بسکہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق — ہر بت خورشید طلعت آفتاب بام ہے

۱۴۵ مستعد قتل یک عالم ہے جلاد فلک — کہکشاں موج شفق میں تیغ خوں آشام ہے

ہو جہاں وہ ساقی خورشید رو مجلس فروز

واں اسدؔ تار شعاع مہر خط جام ہے

توڑ بیٹھے جب کہ ہم جام و سبو پھر ہم کو کیا — آسماں سے بادۂ گلفام گر برسا کرے

---

۱۴۷ بہ رہن ضبط ہے آئینہ بندی گوہر — وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشم پرنم ہے

اسدؔ بناز کی طبع آرزو انصاف — کہ ایک دم ہم ضعیف اور غم دو عالم ہے

---

۱۴۸ کشود غنچۂ خاطر عجب نہ رکھ غافل — صبا خرامی خوباں بہار ساماں ہے

---

۱۴۹ شفق بدعوی عاشق گواہ رنگیں ہے — کہ ماہ دزد حنائے کف نگاریں ہے

---

۱۵۰ دامگاہ عجز میں ساماں آسائش کہاں — پرفشانی بھی حریف خاطر آسودہ ہے

۱۵۱ کیا کہوں پرواز کی آوارگی کی کشمکش — عافیت سرمایۂ بال و پر نگشودہ ہے

---

۱۵۲ فصل گل میں دیدۂ خونیں نگاہاں جنوں — دولت نظارۂ گل سے شفق سرمایہ ہے

شورش باطن سے یاں تک نگہ غفلت ہو گداز — شیون دل، ایک سرود خانہ ہمسایہ ہے

دامن گردوں سے رسچاتا ہے ہنگام وداع گوہر شب تاب اشک دیدہ خورشید ہے

---

۱۵۳ فرصت، آئینہ صد رنگ خود آرائی ہے روز و شب یک کف افسوس تماشائی ہے
۱۵۴ شمع آسا ہے سر دعویٰ و گو پائے ثبات گل صد شعلہ بیک جیب شکیبائی ہے

نوائے خفتۂ الفت اگر بیتاب ہو جائے پر پروانہ، تار شمع پر مضراب ہو جائے
برنگ گل اگر شیرازہ بند بیخودی رہیے ہزار آشفتگی، مجموعۂ یک خواب ہو جائے
۱۵۵ اسد باوصف مشق بے تکلف خاک گردیدن غضب ہے گر غبار خاطر احباب ہو جائے

تا چند ناز مسجد و بت خانہ کھینچیے جوں شمع دل بخلوت جانانہ کھینچیے
عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے
خود نامہ بن کے جائیے اس آشنا کے پاس کیا فائدہ کہ منت بیگانہ کھینچیے

---

۱۵۶ گر صفحے کو نہ دیکھیے پرداز سادگی جز خط عجز، نقش تمنا نہ کھینچیے
۱۵۷ دیدار دوستاں لباسی ہے ناگوار صورت بکار خانۂ دیبا نہ کھینچیے
ہے بے خمار نشہ خون جگر اسد دست ہوس بگردن مینا نہ کھینچیے

---

۱۵۸ ہے مشق وفا جانتے ہیں لغزش پا تک اے شمع تجھے دعویٰ ثابت قدمی ہے
۱۵۹ واماندۂ ذوق طرب وصل نہیں ہوں اے حسرت بسیار تمنا کی کمی ہے

---

۱۶۰ چمن زار تمنا ہو گیا صرف خزاں لیکن بہار نیم رنگ آہ حسرتناک باقی ہے

نہ حیرت چشمِ ساقی کی نہ صحبت دورِ ساغر کی　　مری محفل میں غالبؔ گردشِ افلاک باقی ہے

۱۶۱　جامِ ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے　　کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

۱۶۲　دریوزہ ساماں ہا اے بے سروسامانی　　ایجادِ گریباں ہا، در پردہ عریانی

۱۶۳　پروازِ تپش رنگے گلزار ہمہ تنگے　　خوں ہو قفسِ دل میں اے ذوقِ پرافشانی

۱۶۴　گلزارِ تمنا ہوں گلچینِ تماشا ہوں　　صد نالہ اسدؔ بلبل دربندِ زباں دانی

۱۶۵　خرابِ نالۂ بلبل شہیدِ خندۂ گل　　ہنوز دعوئ تمکین و بیمِ رسوائی!

۱۶۶　ہزار قافلۂ آرزو بیابان مرگ　　ہنوز محملِ حسرت بدوشِ خودرائی!

۱۶۷　وداعِ حوصلہ، توفیقِ شکوہ عجزِ وفا　　اسدؔ ہنوز گمانِ غرور دانائی!

۱۶۸　گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے　　کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے

۱۶۹　فسردگی میں ہے فریادِ بیدلاں تجھ سے　　چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے

۱۷۰　بہارِ حیرتِ نظارہ، سخت جانی ہے　　حنائے پائے اجل، خونِ کشتگاں تجھ سے

۱۷۱　پری بہ شیشہ و عکسِ رخ اندر آئینہ　　نگاہِ حیرتِ مشاطہ، خوں فشاں تجھ سے

۱۷۲　طراوتِ سحر ایجادئ اثر یک سو　　بہارِ نالہ و رنگینئ فغاں تجھ سے

۱۷۳　چمن چمن گلِ آئینہ در کنارِ ہوس　　امید محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے

۱۷۴　نیاز پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے　　جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے

۱۷۵　بہانہ جوئی رحمت، کمیں گرِ تقریب　　وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے

۱۷۶　اسدؔ بہ موسمِ گل در طلسمِ کنجِ قفس　　خرام تجھ سے صبا تجھ سے گلستاں تجھ سے

وہ تشنۂ سرشارِ تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بکیفیتِ ساغر نظر آوے

یک نفس، ہر یک نفس جاتا ہے قسطِ عمر میں
حیف ہے ان کو جو کہویں زندگانی مفت ہے

---

۱۷۷ وہمِ طربِ ہستی، ایجادِ سیہ مستی
تسکینِ دو صد محفل یک ساغرِ خالی ہے
زندانِ تحمل میں، مہمانِ تغافل ہیں
بے فائدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے

---

۱۷۸ اسدؔ جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو حالِ دل پر سیدنی جائے

رباعیات

ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا
ممکن نہیں یک زبان و یک دل ہونا
میں تجھ سے اور مجھ سے تو پوشیدہ
ہے مفت نگاہ کا مقابل ہونا

اے کاش! بتاں کا خنجرِ سینہ شگاف
پہلوے حیات سے گزر جاتا صاف
اک تسمہ لگا رہا کہ تا روزے چند
رہیے نہ مشقتِ گدائی سے معاف

اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ
ہے اصلِ خرد سے سرشار اندیشہ
یک قطرہ خون و دعوتِ صد نشتر
یک وہم و عبادتِ ہزار اندیشہ

دل سوزِ جنوں سے جلوہ منظر ہے آج　　نیرنگ زمانہ فتنہ پرور ہے آج !

یک تار نفس میں جوں طناب صناع　　ہر پارۂ دل برنگ دیگر ہے آج

(انتخاب اشعار از قصائد منقبت)

۱۷۹　ہے کفِ خاک، جگر تشنۂ صد رنگ ظہور　　غنچے کے میکدے میں مست تامل ہے بہار

۱۸۰　موجِ خمیازہ یک نشہ، چہ اسلام و چہ کفر　　کجی یک خط مسطر، چہ توہم چہ یقین !

۱۸۱　قبلہ و ابروے بت، یک رہ خوابیدۂ شوق　　کعبہ و بت کدہ یک محمل خواب سنگین

۱۸۲　نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیر نہ نگاہ　　گرد جوہر میں ہے آئینہ دل پردہ نشیں

۱۸۳　بفراز گاہ عبرت، چہ بہار و کو تماشا　　کہ نگاہ ہے سیہ پوش لبعزاے زندگانی

نہ وفا کو آبرو ہے نہ جفا تمیز جو ہے　　چہ حساب جانفشانی چہ غرور دلستانی

۱۸۴　چہ امید و ناامیدی؟ چہ نگاہ و بے نگاہی　　ہمہ عرض ناشکیبی، ہمہ ساز جانستانی

مجھے بادۂ طرب سے بخمار گاہ قسمت　　جو ملی تو تلخ کامی جو ہوئی تو سرگرانی

نہ ستم کر اب تو مجھ پر کہ وہ دن گئے کہ ہاں تھی　　مجھے طاقت آزمائی تجھے الفت آزمائی

بہ ہزار امیدواری رہی ایک اشکباری　　نہ ہوا حصول زاری بجز آستیں فشانی

یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خوان گفتگو پر دل و جاں کی مہمانی

متفرق کلام

(جو نسخۂ حمیدیہ کے علاوہ دیگر ذرائع سے منظرِ عام پر آیا)

ان دلفریبیوں سے نہ کیوں اس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا

(عودِ ہندی)

خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا اور ہم کیا

(خطوطِ امیر)

چند تصویرِ بتاں، چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

(مطبوعہ حسرت موہانی)

ہندوستاں کی بھی عجب سرزمین ہے
جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور
جیسے کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص کا ہوا ہے اسی ملک سے ظہور

(احوالِ غالب)

دیکھتا ہوں اسے تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

(عمدۂ منتخبہ)

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو
برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

(نسخۂ شیرانی)

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں
ہے حیا مانعِ اظہار کہوں یا نہ کہوں
نہیں کرنے کا میں تقریر ادب سے باہر
میں بھی ہوں محرمِ اسرار کہوں یا نہ کہوں
شکر سمجھو اسے یا کوئی شکایت سمجھو
اپنی ہستی سے ہوں بیزار کہوں یا نہ کہوں
اپنے دل ہی سے میں احوالِ گرفتاریِ دل
جب نہ پاؤں کوئی غمخوار کہوں یا نہ کہوں
دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی میرا
ہوں اک آفت میں گرفتار کہوں یا نہ کہوں

میں تو دیوانہ ہوں اور ایک جہاں ہے غماز — گوش ہیں در پس دیوار کہوں یا نہ کہوں
آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسدؔ — حسب حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں

________ (دیوان معروف)

محفل شمع عذاراں میں جو آ جاتا ہوں — شمع ساں میں تہ دامانِ صبا جاتا ہوں

________ (عمدہ منتخبہ)

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں — میں دشت غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں
جاں لب پہ آئی تو بھی نہ شیریں ہوا دہن — از بسکہ تلخی غم ہجراں چشیدہ ہوں
نے سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ — میں معرض مثال میں دست بریدہ ہوں
اہل ورع کے حلقہ میں ہر چند ہوں ذلیل — پر عاصیوں کے زمرے میں میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں ۱۸۵

________ (بیاض علائی)

(حسب بالا اشعار کے ہم طرح اشعار نمبر ۸۳، ۸۴، ۸۵، و ۸۶ پر ملاحظہ فرمائیے)

ہم کیا کہیں کسی سے کیا ہے طریق اپنا — مذہب نہیں ہے کوئی ملت نہیں ہے کوئی

________ (بیاض علائی)

دیکھ وہ برق تبسم بس کہ دل بیتاب ہے — دیدۂ گریاں مرا فوارۂ سیماب ہے
کھول کر دروازۂ میخانہ نبولا مے فروش — اب شکست توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

________ (عمدہ منتخبہ)

اک گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے — رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے
پروانے کا نہ غم ہو تو پھر کس لئے اسدؔ — ہر رات شمع شام سے لے تا سحر جلے

________ (عمدہ منتخبہ)

کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو
تکلف بر طرف تجھ سے تری تصویر بہتر ہے

——— (گلِ رعنا)

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے
مگر اک شعر میں اندازِ رسا رکھتے تھے

اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا
آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے

زندگی اپنی جب اس شکل سے گذری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

——— (از وحید الدین صاحب نظامی)

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے
ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

——— (عودِ ہندی)

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

(اردوئے معلیٰ)

خدا کے واسطے پردہ نہ کعبے کا اٹھا واعظ
کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

——— (دیوانِ غالب طاہر اڈیشن)

[یہ شعر کلیاتِ ظفر میں بھی ہے]

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی
تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل، دلِ مضطر میرا
کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ؟
خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غیر سے دیکھیے کیا خوب نباہی اس نے
نہ سہی ہم سے پر اس بت میں وفا ہے تو سہی

نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں میں
کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی

کبھی آ جائیگی کیوں کرتے ہو جلدی غالبؔ — شہرۂ تیزیٔ شمشیر قضا ہے تو سہی

(اردوئے معلےٰ) — (دیوان غالب طاہر اڈیشن)

کہے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلائے — کوئی بتاؤ کہ وہ زلف خم بخم کیا ہے؟

نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا — خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

(خطوط غالب)

ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گذری — دوست جو ساتھ میرے تالب ساحل آئے

وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو اے شیخ — ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے

آئیں جس بزم میں وہ لوگ پکار اٹھتے ہیں — لو وہ برہم زن ہنگامۂ محفل آئے

دیدہ خوں بار ہے مدت سے ولے آج ندیم — دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے

(مطبوعہ حسرت موہانی)

بتو! توبہ کرو، تم کیا ہو؟ جب ادبار آتا ہے
تو یوسف سا حسیں بکنے سر بازار آتا ہے

(ماہ نو، فروری ۱۹۵۰ء)

دم واپسیں بر سر راہ ہے — عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے

(یادگار غالب)

(انتخاب از قطعہ برائے نواب کلب علی خاں والی رامپور)

مقام شکر ہے اے ساکنان خطۂ خاک — رہا ہے زور سے ابر ستارہ بار برس

خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی — در حضور پہ اے ابر بار بار برس

(مکاتیب غالب)

(انتخاب از قطعہ در مدح ابو القاسم صاحب قاسم و مرزا احمد بیگ صاحب طپاں)

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک — وضع میں گو ہوئی دو سر، تیغ ہے ذو الفقار ایک

ایک وفا و مہر میں، تازگی بساط دہر — لطف و کرم کے باب میں زینت روزگار ایک

گلشن اتفاق میں، ایک بہار بے خزاں — مے کدہ وفاق میں بادہ بے خمار ایک

زندہ شوق شعر کو ایک چراغ انجمن — کشتہ شوق شعر کو، شمع سر مزار ایک

جان وفا پرست کو ایک شمیم نوبہار — فرق ستیزہ مست کو ابر تگرگ بار ایک

لایا ہے کہہ کے یہ غزل، شائبہ ریا سے دور
کر کے دل و زبان کو، غالب خاکسار ایک

(متفرقات غالب)

مطالب اشعار

(۱)

نگاہ بے حجاب ناز مجھ سے غافل نہیں تھی بلکہ میری سخت جانی دیکھ کر اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر وہ میری جانب اٹھی تو وہ مجھے ختم نہیں کر سکے گی یا اسے میری حالت دیکھ کر رحم آجائے گا اور یہ دونوں صورتیں اس کی روایتی شہرت کو صدمہ پہونچاتیں لہذا وہ مجھے نظر انداز کر گئی۔ اسے تغافل سے تعبیر کرنا محض بدگمانی ہے

دوسرے لطیف تر معنی یہ ہو سکتے ہیں کہ میری سخت جانی کی اذیتوں کی وجہ سے نگاہ بے حجاب ناز کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ اگر وہ میری جانب اٹھی تو میری حالت بد سے بدتر ہو جائے گی یا میری زبوں حالی اس سے دیکھی نہ جائے گی لہذا اس نے مجھ سے چشم پوشی کی۔ یہ اس کا ستم نہیں بلکہ میرے حال پر کرم تھا۔ اسے تغافل سے تعبیر کرنا محض بدگمانی ہے۔

عبدالباری صاحب آسی نے اس شعر کا مطلب یوں لکھا ہے "تغافل کی وجہ ہے؟ بدگمانی کی وجہ سے؟ نہیں نہیں ان سب کی وجہ سے نہیں بلکہ میری سخت جانی کی وجہ سے اس کی نگاہ بے حجاب ناز کو کسی نقصان پہونچنے کا اندیشہ پیدا ہو گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ مجھ تک نہیں پہونچ سکی۔"

---

(۲)

جس کسی پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ زندگی میں فراغت کے طرب انگیز لمحات کس قدر جلد گزر جاتے ہیں وہ لالہ کی طرح محمل ہی پر جام پی لینا غنیمت سمجھتا ہے یعنی وہ اپنے طرب انگیز لمحات سے لطف اندوز ہونے میں تاخیر نہیں کرتا مبادا

وہ گزر جائیں اور پھر ہاتھ نہ آئیں ۔

لالہ کی شاخ کو محل سے اور اس کے پھول کو جام سے تشبیہہ دی ہے ۔

---

(۳)

میں خواہ عدم کا راستہ طے کر رہا تھا خواہ وجود کا ہر جگہ مجھے آسودگی کے بجائے تنگی ہی نصیب ہوئی ۔ میرا ہر سفر حاسدوں کی تنگ چشمی کی سی قسمت رکھتا تھا حاسدوں کا تنگ چشم ہونا مشہور ہے ۔ مطلب یہ کہ مجھے کبھی بھی حسب خواہش فراغت اور وسعت نصیب نہیں ہوئی ۔

انسان عدم سے وجود میں آتا ہے اور پھر وجود سے عدم کو جاتا ہے اس آمد و رفت میں انسان ہمیشہ غیر آسودہ ہی رہتا ہے ۔ اقبال نے کہا ہے ؎

یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی
ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

---

(۴)

میں سر تا قدم جذبہ عبودیت سے سرشار تھا لیکن میری جانب کوئی التفات ہی نہیں کیا گیا ۔ آفتاب کی ذرا سی گرمی سے شبنم اسی میں جذب ہو جاتی ہے لیکن اگر آفتاب شبنم کی طرف کوئی توجہ ہی نہ کرے تو اس میں شبنم کا کیا قصور ؟ یہ اپنی نوعیت کا لاجواب شعر ہے ۔

---

(۵)

شاعر فریاد کرتا ہے کہ یارب تمنا کا دوسرا قدم کہاں ہے جب کہ سارا

دشت امکاں محض اس کے ایک نقش پا کی حیثیت رکھتا ہے

انسان کی تمنا کے مقابلہ میں" دشت امکاں " واقعی بہت تنگ ہے کیونکہ تمنا محض امکانات کی پابند نہیں۔ کل تک جو باتیں دائرہ امکانات سے باہر سمجھی جاتیں آج ممکنات بن چکی ہیں لیکن اسی مناسبت سے انسان کی تمناؤں میں بھی ترقی ہو رہی ہے اور ان کا افق دور سے دور تر ہوتا جا رہا ہے۔ مثلاً کچھ ہی سال پہلے جب تک ہوائی جہاز ایجاد نہیں ہوا تھا انسان ہوا میں اڑنے کی تمنا کرتا تھا لیکن اب جبکہ وہ اڑنے لگا ہے تو وہ مریخ اور چاند پر پہونچ جانے کی تمنائیں کر رہا ہے شاعر نے "دشت امکاں" کو تمنا کا نقش پا "بہت خوب کہا ہے۔ تمنائیں ہمیشہ امکانات کو پیچھے چھوڑتی رہتی ہیں۔

اس مضمون کو اس طرح سے کہنا غالب ہی کا حصہ ہے۔

---

(۶)

رات کو معشوق کے خیال نے خواب میں بڑے حسین مناظر دکھائے چنانچہ انکا یہ اثر ہوا کہ صبح کو اپنے بوریئے کے نقش کو موجہ گل پایا۔

اس سے لطیف تر یہ معنی ہیں کہ رات کو معشوق کے خیال نے خواب میں بڑے حسین مناظر دکھائے لیکن صبح جب آنکھ کھلی تو جہاں رات کو ہم موجہ گل دیکھ رہے تھے۔ وہاں اپنے نقش بوریا کو بدستور پایا۔ وہی مثل کہ رہیں جھونپڑی میں اور خواب دیکھیں محلوں کے۔ غالب نے ایک جگہ اور کہا ہے۔

تھا خواب میں، خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

---

(۷)

شوق دیدار بھی بلا کا آئینہ ساماں ہے. اس نے خاک کے ہر ذرہ کو جلوؤں سے سرشار ایک ساغر بنا دیا ہے. یعنی شوق دیدار کی آئینہ سامانی کی بدولت اب خاک کا ہر ذرہ معشوق کی جلوہ نمائی کا ایک آئینہ بن گیا ہے۔

لطیف مضمون کو طرز ادا نے لطیف تر بنا دیا ہے۔

---

(۸)

خدا کی رحمت کی وسعت تو دیکھیئے کہ اس نے میرے جیسے کافر کو بخش دیا کہ جس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا تھا یعنی میں خدا کی رحمت کا منکر تھا کیونکہ اگر مجھے خدا کی رحمت کا اعتقاد ہوتا تو میں گناہ بھی کرتا یا یہ کہ میں ایسا ازلی کافر تھا جو اپنے کفر کے لئے گناہوں کا منت کش نہیں تھا. میرے ایسے کافر کا بخش دیا جانا خدا کی رحمت کی وسعت ظاہر کرتا ہے۔

اس شعر کے ایک طنز یہ معنی بھی نکلتے ہیں. رحمت حق نے اگر میرے ایسے کافر کو بخش دیا کہ جس نے کوئی گناہ ہی نہیں کیا تھا تو اس سے اس کا کیا کمال ظاہر ہوا؟ میں گناہ کرتا اور بخش دیا جاتا تب واقعی ایک بات بھی تھی۔

---

(۹)

بزم معشوق میں ساز عشرت کے نغموں کا ہجوم تھا اور یہاں ہم اپنے نفس کے تار پر ناخن غم سے مضراب کا کام لے رہے تھے ۔

نفس کو تار سے خوب تشبیہہ دی ہے. عاشق کی زبوں حالی کی انتہائی کیفیت دکھائی ہے ۔

---

(۱۰)

آئینہ دیکھتے ہی اس کے ناز وادا میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ وہ اپنی صورت کو اس ذوق و شوق سے دیکھنے لگا کہ نگاہوں کے سامنے ایک قیامت کا منظر آگیا۔ آئینہ نے وہی کام کیا جو ایک سوئے ہوئے فتنے کو جگانے کے لئے ایک چلو پانی کام کرتا ہے آئینہ کو مشت آب سے تشبیہہ دی ہے اور خوب دی ہے۔

---

(۱۱)

بے ورنہ تو ہمیں بے خبر مت کہہ یعنی ہم پر یہ الزام نہ لگا کہ ہم نے تجھے دیکھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنی خود بینی سے پوچھ جس نے تجھے ایسا محو کر رکھا تھا کہ تجھ کو خبر ہی نہ ہوئی کہ جب وقت تو آئینہ دیکھ رہا تھا ہم تجھے دیکھ رہے تھے اور ہمارے ذوق نظر کے سمندر کے مقابلے میں تیرا آئینہ پایاب تھا۔

ذوق نظر کو قلزم اور آئینے کو پایاب خوب کہا ہے یہ شعر غالب کے خاص رنگ کا ہے۔

---

(۱۲)

اسد کی بے دلی سے اب اس کی افسردگی بڑھتی ہی جاتی ہے۔ وہ دن اب یاد آتے ہیں کہ جب اسے دوستوں کی ہم نشینی کا شوق تھا۔

---

(۱۳)

اگر رنج بے تابی کا مدعا آسودگی ہے تو ہم یہ آسودگی نہیں چاہتے ہم اپنی زندگی گردش پیمانہ پر قربان کرتے ہیں۔ پیمانہ جب تک گردش میں رہتا ہے۔

وہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو سیراب کرتا ہے اور جب رک جاتا ہے تب بے فیض ہو جاتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے ؎

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

عبدالباری صاحب آسی نے اپنی شرح میں یہ دوسرے معنی بھی لکھے ہیں "اگر پیمانہ کی گردش اور رنج بیتابی آسودگی ہے تو ہم اس کے قربان"

---

(۱۴)

اسد میری وحشت پرستی گوشہ تنہائی دل تک محدود ہے یعنی میرا پیچ و تاب میرے دل ہی میں گھٹ کر رہ جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے موج مئے کی بیتابی ساغر ہی کے اندر ختم ہو جاتی ہے۔ چائے کی پیالی میں طوفان ایک انگریزی مثل بھی ہے۔

---

(۱۵)

انتہائی عجز و بے سامانی میں انسان ہر قسم کی قید اور پابندی سے آزاد ہو جاتا ہے اور اسکی ساری کائنات محض اسکی ذات تک محدود ہو جاتی ہے فرعونیت میں بھی یہی ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ دو متضاد کیفیتیں اپنے نتیجہ میں ایک ہو جاتی ہیں لہذا شاعر نے غیر معمولی بصیرت سے کام لے کر ان دونوں کیفیتوں کو توام کہا ہے، یہ بھی ہوتا ہے کہ انتہائی بندگی میں انسان فنا فی اللہ ہو جاتا ہے اور یہ وہ کیفیت ہے کہ اس میں بندگی اور خدائی میں

کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

اکثر بندگی کبر اور غرور کا باعث بھی ہوا کرتی ہے ایسی بندگی بھی خدائی کے دعویٰ کے مترادف ہوتی ہے۔

ایک دوسرا شعر ہے ؎

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی   بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

---

(۱۶)

بزم جہاں میں جو ایک وحشت کدہ تھا ہم نے شمع کی طرح شعلہ عشق ہی کو اپنا سر و ساماں سمجھا یعنی اپنی زندگی میں ہم نے سوائے عشق کے اور کسی دوسری چیز سے کوئی واسطہ اور سروکار نہیں رکھا۔ شعلہ عشق کہہ کر شاعر نے یہ بھی اشارہ کر دیا کہ اسی میں ہماری بربادی بھی مضمر تھی۔ شمع کو بھی اس کا شعلہ ہی ختم کرتا ہے

---

(۱۷)

میں سراپا اپنی شکست کا مظہر ہوں گویا میں ان لوگوں کا ارادہ ہوں جو ایک عالم سے مایوس ہو چکے ہیں اور جن کا کوئی ارادہ یا منصوبہ کبھی پورا نہیں ہوتا۔

---

(۱۸)

اسدؔ میں پژمردہ لوگوں کا تبسم ہوں جو اگر تکلف سے کبھی نمایاں بھی ہو جاتا ہے تو اپنے جلو میں تاسف لاتا ہے۔

جن لوگوں کے دل مردہ ہو چکے ہیں وہ اگر کبھی تکلفاً ہنس بھی دیتے ہیں تو ان کی ہنسی میں درد پنہاں ہوتا ہے۔

(۱۹)

پھولوں کی رنگینیوں کی بہار سے اشکباری کا ساماں پیدا ہوگیا ہے جیسے بہار کا پر کیف منظر دیکھ کر بجلی از خود رفتہ ہوگئی ہو اور وہ تڑپ تڑپ کر ابر کی رگ کو نشتر لگا رہی ہو یعنی اسے برسنے پر آمادہ کر رہی ہو۔ اشکباری اور ابر کے برسنے کی مماثلت ظاہر کی ہے۔

---

(۲۰)

میری آہ کا ہر ذرہ اپنے ساتھ طاؤس لئے ہوئے ہے یعنی میری ہر آہ میں رنگینیاں بھری ہوئی ہیں۔ یا رب! آخر میرا نفس کس جلوہ گاہ کا غبار ہے جس سے میری آہوں میں بھی یہ رنگ آمیزی ہوگئی ہے۔ بڑا لطیف اشارہ یہ ہے کہ جس جلوہ گاہ کی حسرت میں میں آہیں بھر رہا ہوں وہ اس قدر حسین ہے کہ اس کے طفیل میں میری آہ کا ہر ذرہ بھی رنگین ہوگیا ہے۔

آہ کا ذرہ۔ طاؤس در رکاب اور نفس کو غبار کہنا غالب ہی کا حصہ ہے۔

---

(۲۱)

جو لوگ بزم سے کنارہ کش ہوگئے ہیں وہ دید سے بھی محروم ہوگئے ہیں یعنی وہ اب کسی سے ملتے جلتے نہیں۔ مینائے مے ان کی نگاہ کے پیروں کا آبلہ بن گئی ہے یعنی اس کی وجہ سے وہ اب کسی طرف اٹھ ہی نہیں پاتی۔ جن لوگوں نے شراب ہی پر تکیہ کیا ہے انھوں نے ساری دنیا سے نظریں پھیر لی ہیں۔

ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں جو لوگ بزم سے کنارہ کش ہوگئے ہیں وہ ساقی کے دیدار سے بھی محروم ہوگئے ہیں اور ساقی کے بغیر مینائے مے پائے نگاہ کا آبلہ

معلوم ہوتی ہے۔

---

(۲۲)

عبدالباری صاحب آسی نے اس شعر کا مطلب یوں لکھا ہے "عشق کے گریبان نیاز سے حسن کے ناز کا پتہ چلتا ہے میں معشوق کی کجکلاہی گوشہ کلاہ کا آئینہ بن گیا ہوں یعنی میری حالت نیاز سے اس کے ناز حسن کا پتہ ملتا ہے اور میرے حال تباہ سے اس کی بے رحمی کا اندازہ ہوتا ہے" مطلب یہ کہ عشق کی پریشان حالی حسن کی تمکنت کی نشاں دہی کرتی ہے۔ میں اپنے معشوق کی بانکی ٹوپی کا آئینہ ہوں۔ یعنی جس قدر وہ مغرور ہے اسی قدر میں عاجز ہوں۔

---

(۲۳)

بے دماغی یعنی بے تعلقی رشک کی بنا پر کوئی شکوہ نہیں کرتی۔ جام مے تمھیں نصیب ہے اور اس کا انتظار میرا مقدر ہے نہ تمھیں شکوہ نہ ہمیں شکایت

---

(۲۴)

سبزہ بیگانہ ہے صبا آوارہ ہے گل ناآشنا یعنی بے مروت ہے چنانچہ بہار کے یہ اجزا ایک شیرازہ وحشت کے پابند ہیں اور ان میں کوئی ہم آہنگی نظر نہیں آتی اس سے زیادہ لطیف معنی یہ ہیں کہ اگرچہ بظاہر سبزہ بیگانہ۔ صبا آوارہ اور گل بے مہر نظر آتے ہیں لیکن ان مختلف الصفات اجزا کے درمیان ایک ناقابل فہم ضبط و نظم قائم ہے اور یہ سب مل کر بہار کی تخلیق کرتے ہیں۔

---

(۲۵)

میرے ذوق سرشار سے میری بے تابی بالکل ظاہر ہو گئی ہے اور میرے جسم پر جو زخم دکھائی پڑتے ہیں وہ دراصل میری بے تابی کی وہ موجیں ہیں جو میرے جسم سے باہر آگئی ہیں۔
موج خمیازہ سے مراد وہ موج ہے جو ساحل سے ٹکرا کر واپس لوٹ رہی ہو۔

---

(۲۶)

یاروں کی طعن آلود عیادت زہر قاتل ہے یہ زخم کا رفو تو کرتی ہے لیکن بچھو کے ڈنک سے اور وہ پہلے سے بھی زیادہ تکلیف دینے لگتا ہے۔

---

(۲۷)

شہرت کے باوجود اس کے انتظامات پردہ راز میں رہتے ہیں۔ نگینے میں جس طرح شرار مستور ہے اسی طرح اس کا نام کبھی ظاہر نہیں ہے۔ حالانکہ ہر طرف اُسی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

---

(۲۸)

آسی صاحب نے اس شعر کا مطلب لکھا ہے" میں ایک نگاہ خاص کی امید پر محمل حسرت کھینچ رہا ہوں یعنی حسرتیں کر رہا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا لطف عام اس کو تغافل پر آمادہ کرے۔ یعنی وہ یہ سمجھے کہ سب میں یہ بھی شریک ہے پھر نگاہ خاص کی احتیاج کیا ہے۔ عناں گیر اور محمل کش حسرت دونوں الفاظ مناسب ہیں" عمومیت سے اپنا گریہ ظاہر کیا ہے۔

---

(۲۹)

کل رات کو جب کہ محفل میں معشوق کا چہرۂ زیبا یاد کیا جا رہا تھا اس وقت شراب کا کوئی داغ بھی لب پیمانہ کا خال معلوم ہوتا تھا۔ مطلب یہ کہ معشوق کے تصور سے میری نگاہ حسین ہو گئی تھی اور ہر چیز حسین نظر آ رہی تھی۔

خال لب پیمانہ سے مراد خال لب معشوق بھی ہو سکتا ہے۔

---

(۳۰)

دوستوں کے برتاؤں سے میرا دل غبار یعنی خاک ہو گیا لیکن میں نے کوئی شکوہ نہیں کیا اور اپنے دل کی خاک ہی میں اپنے شکوے کو بھی پوشیدہ کر دیا مجھے اپنے دوستوں کی محبت تو خیر شکایت بھی عزیز ہے اور میں اسے اپنے دل سے لگائے رکھنا چاہتا ہوں چنانچہ اس شکایت کو خزانہ سمجھ کر اپنے دل ہی کی خاک میں دفن کر دیا۔ ایسے عزیز خزانہ کو چھپانے کے لیے یہی ویرانہ مناسب بھی تھا۔

پرانے زمانے میں حفاظت کی خاطر خزانے کو ایسی جگہوں پر دفن کیا جاتا جہاں دوسروں کو اس کا پتہ نہ چل سکے۔

---

(۳۱)

موسم گل میں میکشوں کے لئے گلگوں حلال ہو گئی ہے کیونکہ انگور کا ہر دانہ دخت رز کی شادی کی شہادت دے رہا ہے شادی کے بعد جو اولاد ہوتی ہے وہ جائز کہلاتی ہے

---

(۳۲)

آؤ بیخودی کے ایک ہی قدم سے صحرا کی بہار لوٹ لیں اور جو کچھ صحرا میں ہے

سے ایک ہی نقش پا سے حاصل کرلیں۔ مطلب یہ کہ عالم بے خودی میں جز و میں کل دیکھ لیں اور صحرا کا لطف محض ایک نقش پا سے دریافت کرلیں۔

---

(۴۳)

اسد کی دیوانگی مسرت کی تمنا کر رہی ہے۔ اس کے دل میں صحرا کا غبار بھرا ہوا ہے لیکن اس کے باوجود اس کے سر میں گلشن کا سودا سمایا ہوا ہے۔ دیوانگی اور مسرت میں وہی بعد ہے جو صحرا اور گلشن میں ہے۔ انسان کسی چیز کی تمنا کرتے وقت اپنی معذوریوں کو پیش نظر نہیں رکھتا۔

---

(۴۴)

محتسب نے میکشوں کے راستے میں طرح طرح کی مشکلات پیدا کر رکھی ہیں ادھر ... کی بیل میں کوئی انگور پیدا ہوتا ہے ادھر محتسب ایسی ناک بھنویں چڑھاتا ہے جیسے وہ انگور نہیں بلکہ کوئی عقدۂ مشکل ہے۔

معترضین کی نکتہ چینیوں پر بہت پر لطف طنز کیا ہے۔ وہ ہر بات کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ انگور کے معصوم پھل میں بھی ان کو شراب کی موجیں نظر آتی ہیں۔

---

(۴۵)

ہمت ہار بیٹھنے سے پیروں کے حوصلے تنگ ہو جاتے ہیں۔ مایوسی کا ہر آنسو پیر دل کا آبلہ بن جاتا ہے یعنی اسے آگے بڑھنے سے روکتا ہے انسان جب اپنی قوت ارادی کھو بیٹھتا ہے تو اس کی صلاحیتیں جواب دے دیتی ہیں۔

(۳۶)

رہبر کا انداز حیرت اے اسد مجھے آگے بڑھنے سے روک رہا ہے مطلب یہ کہ جب میرا رہبر خود ہی شکوک اور شبہات میں گرفتار ہے تو میں اس کی قیادت میں کیا آگے بڑھوں؟ چنانچہ میرے لئے خضر کا نقش پا بجائے رہنما ثابت ہونے کے دیوار کا کام کر رہا ہے۔

حضرت خضر: مشہور روایتی رہنما۔ سد سکندر: سکندر کی بنوائی ہوئی ترکستان میں ایک دیوار ہے۔

سکندر اور حضرت خضر کا واقعہ مشہور ہے۔ غالب ہی کا ایک شعر ہے

کیا کیا خضر نے سکندر سے
اب کسے رہنما کرے کوئی؟

---

(۳۷)

فلک کی آنکھ جو ہر کسی کے لئے برا چاہتی ہے وہ ناامیدی کے عروج کو کیا سمجھ سکتی ہے۔ میری آہ بے تاثیر سے ایک ایسی بہار پیدا ہے جو بے خزاں ہے۔

میری آہ بے تاثیر نے ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے جو کہ قائم اور برقرار ہے فلک بداندیش جو ہمیشہ انقلابات لاتا رہتا ہے وہ میری ناامیدی کے اس کمال کی بھلا کیا داد دے سکتا ہے؟

چشم زخم فلک سے فلک کی بداندیشی مراد ہے۔ بہار بے خزاں سے مراد ایسی کیفیت ہے جس کو دوام حاصل ہو۔ غالب کا ایک اور مشہور شعر ہے ؎

گردش رنگ طرب سے ڈر ہے
غم محرومئ جاوید نہیں

(۳۸)

آسی صاحب نے اس شعر کے معنی یوں لکھے ہیں کہ "ایک ہم ہیں کہ ہماری عمر اس میں صرف ہوگئی کہ بہارِ حسن دیکھ رہے ہیں اور ایک عندلیب ہے کہ اس کے ماہ و سال پلٹتے رہتے ہیں کبھی خزاں ہوتی ہے اور کبھی بہار ہوتی ہے اور برابر رنگ چمن گردش کرتا رہتا ہے"

سائنس کا جدید ترین نظریہ یہ ہے کہ وقت محض ایک اضافی قیاس ہے درحقیقت اس کا کوئی وجود نہیں۔ غالباً اس شعر میں یہی بات شاعر کہتا ہے میری عمر بہارِ حسن میں گذر گئی۔ مجھے سوائے نظارۂ حسن کے وقت گزرنے کا کوئی احساس ہی نہیں۔ میری مثال اس بلبل سے دی جاسکتی ہے جو گردش رنگ چمن ہی کو اپنے ماہ و سال سمجھتا ہے۔

---

(۳۹)

تنہائی ایک خزانہ ہے جہاں شاعر اپنے تصورات کی دنیا میں گم ہو کر طرح طرح کے لطف اٹھاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب دوست اور اعزا برابر میرے گنجِ تنہائی میں نقب زن ہوتے رہیں یعنی میری تنہائی میں مخل ہوتے ہوں تو پھر اس کی پاسبانی ایک بیکار سی بات ہے

---

(۴۰)

پیمانۂ فرصت یعنی زندگی کا محمل ایک حباب پر رکھا ہوا ہے یعنی اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ ابھی ہے اور ابھی نہیں ہے۔ ایسی صورت میں خوب جی بھر کر بادہ پیمائی کرنے کے دعوے محض بیکار ہیں۔ یہ شعر غالب کے مخصوص رنگ کا ہے۔

(۴۱)

اے اسدؔ سجدہ عجز یعنی عبادت گذاری پر کوئی غرور کرنا مناسب نہیں ہے یہ عالم تسلیم ہے یعنی یہاں ہر بات خدا کی مرضی کی محتاج ہے اور اس کی عبودیت سے سرشار ہے پھر اپنی عبادت کے متعلق بڑھ چڑھ کر باتیں بنانا چھوٹا منھ بڑی بات ہے۔

---

(۴۲)

میری شام وصال بھی آئی تو ادھوری جس کے غم سے میں داغ بنگیا ہوں بزم میں جو چراغ جل رہا ہے اس سے نور سحر آشکار ہے جو یہ اندیشہ پیدا کر رہا ہے کہ بہت جلد صبح ہونے والی ہے۔

عجیب و غریب شعر کہا ہے۔ ایک خاص ذہنی کیفیت کی طرف اشارہ ہے۔ انسان اپنا مقصد حاصل کر لینے کے بعد بھی غیر مطمین رہتا ہے اور معمولی سے معمولی باتوں کو بھی اس شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے کہ اس کی وجہ سے میرا گوہر مقصود میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ہر کمال کے ساتھ زوال کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔

ایک دوسری جگہ غالب نے کہا ہے۔

وصل میں دل انتظار طرفہ رکھتا ہے مگر
فتنہ تاراج تمنا کے لئے درکار ہے

---

(۴۳)

سویرا ہونے تک منزل مقصود پر پہونچنا ہے یعنی بیمار محبت یہ رات نہیں گذار سکے گا۔ وہ اس دنیا سے سفر کر رہا ہے چنانچہ گھر کے چراغ کا دھواں غبار راہ معلوم ہو رہا ہے ہجرت سے پہلے گھر پر جو اداسی اور مایوسی چھا جاتی ہے

اس کا انتہائی پر اثر نقشہ کھینچا ہے

---

(۴۴)

ملک حسن کی سیر کرا در مینا لوں کو نذر خمار کر دے۔ یار کی چشم مست کی گردن مینا بھی باج گذار ہے۔ مطلب یہ کہ شراب کا کیفیت بھی حسن یار کا حلقہ بگوش ہے تو حسن یار کا گرویدہ بن نہ کہ شراب کا۔

---

(۴۵)

ساقی کی خوشامدیں اگر یہی ذلتیں ہیں تو ان سے باز آ اور اپنے درد مند دل کے شراب خانے ہیں ساغر پی یعنی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلا اور ضبط سے کام لے۔

---

(۴۶)

اے عجز تمنا یعنی عبادت تو کس بات پر مغرور ہے۔ تیری دعا محض تیری آشفتہ سری ہے اور تیری دعا کی تاثیر کچھ بھی نہیں ہے۔

عبادت کو عجز تمنا کہا ہے۔ عبادت میں عجز بھی ہوتا ہے اور تمنا بھی۔

---

(۴۷)

دشمنوں کی سنگ دلی کا جواب ہمت ہے لیکن شیشہ جیسا دل رکھنے والے دوستوں سے مجھے جو اذیت پہونچتی ہے۔ اس کے لئے میں فریاد کرنے پر مجبور ہوں۔ دشمنوں کی سنگ دلی کے جواب میں دوستوں کی شیشہ دلی کہا ہے۔ سنگ اور شیشہ کا یہ فرق تو ظاہر ہی ہے کہ ایک سخت ہوتا ہے اور دوسرا نازک لیکن اسکے علاوہ

ان دونوں میں یہ فرق بھی موجود ہے کہ ایک باہر سے چوٹ پہونچاتا ہے دوسرا اندر ہی اندر چبھتا ہے۔

اس شعر کے ایک لطیف تر معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ دشمنوں کے مظالم کا جواب تو میری ہمت ہو سکتی ہے لیکن دوستوں کی "شیشہ دلی" یعنی رحم اور ہمدردی میرے لئے ناقابل برداشت ہے اور میں اس کے خلاف فریاد کرنے پر مجبور ہوں۔

---

(۴۸)

میری نگہ نہاں خانہ دل میں سرنگ لگا دیتی تھی یعنی رازہائے درون پردہ کو معلوم کر لیتی تھی چنانچہ منافقین کو اس سے خطرہ لاحق رہتا تھا۔ اب میرے بعد منافقین کا یہ خطرہ دور ہو گیا ہے۔ نقاب سرنگ کھودنے والے کو کہتے ہیں۔ اسی مضمون کو غالب نے فارسی میں یوں لکھا ہے ؎

نگہم نقب ہمی زد بہ نہاں خانہ دل
مژدہ باد اہل ریا راکہ زمیداں رفتم

---

(۴۹)

ہم نے جگر پہ سو زخم کھائے لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ بھول کی کم ظرفی ملاحظہ ہو کہ اس نے سینے پر صرف ایک زخم کھایا اور اس کی داد طلب کرنے کے لئے اسکی نمائش کر رہا ہے۔ بہت خوب کہا ہے۔

---

(۵۰)

یہ اللہ والے لوگ در پردہ خوب سیہ کاری کرتے ہیں چنانچہ اسی منافقت

کے باعث ان کے خرقوں کا استر ایسا سیاہ ہو کر رہ گیا ہے جیسے سیاہ روشنائی میں پڑا ہوا کپڑا۔

---

(۵۱)

تو پست فطرت ہونے کے باوجود اپنے خیالات بہت اونچے رکھتا ہے۔ تیری مثال ایک ایسے لڑکے کی ہے جو اپنے قد سے اونچی لاٹھی لے کر چلے تشبیہہ اتنی موزوں دی ہے کہ شعر کی وضاحت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

---

(۵۲)

تیری آنکھ میں دل کا خون نہیں ہے اور تیرا دل جوش نگاہ سے خالی ہے یعنی تجھ میں خلوص اور طلب صادق نہیں ہے ایسی صورت میں تو محض زبان سے اپنی ہوس گل یعنی عاشقی کا اظہار کب تک کرتا رہے گا؟

---

(۵۳)

بزم محض عیش و طرب کی یادگار بن کر رہ گئی ہے یعنی زوال پذیر ہے اور چمن کی رنگینیاں بہت جلد اڑ جانے والی ہیں پھر ایسی صورت میں شمع و گل یا پروانہ و بلبل کا کیا اعتبار؟ جب بزم ہی نہ ہو گی تو پھر شمع اور پروانہ کہاں ہوں گے اور جب چمن ہی نہیں ہو گا تو پھر گل اور بلبل کہاں دکھائی دیں گے؟

---

(۵۴)

یاروں کی بدمستی سے میخانہ پامال ہو گیا۔ ان کا آپے سے باہر ہو کر شراب اچھالنا

میخانے کے حق میں ننگ باری ثابت ہوا۔
جب کوئی شخص اپنے آپ کو بھول کر غیر ذمہ داری کی حرکتیں شروع کر دیتا ہے تو وہ اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے باعث تباہی ثابت ہوتا ہے۔ میخانہ اپنے میخواروں ہی کے ہاتھوں تباہی کو پہونچا۔

---

(۵۵)

اے فلک تو چاہے ساری تعمیر کائنات کو مٹا دے لیکن عہد وفا کی بنیاد کو مضبوط سے مضبوط تر کرتا رہ !! عہد وفا سے مراد ہے اخلاص اور محبت۔

---

(۵۶)

صنعت ایجاد کے فریب کا تماشا دیکھ۔ نگاہ عکس کھینچ رہی ہے اور خیال آئینے تیار کر رہا ہے۔ مطلب یہ کہ نگاہ حسین مناظر دیکھ رہی ہے اور انھیں کی بنیاد پر خیال تصورات کے ہوائی قلعے بنا رہا ہے۔ بے حد دل کش شعر ہے۔

---

(۵۷)

فکر کی زیادتی سے دل شراب کی موج کی طرح لرز رہا ہے۔ میرا دل ایک نازک شیشہ ہے جس میں فکر کی ایسی تند و تیز شراب بھری ہوئی ہے جو شیشے کو پگھلا دینے کی طاقت رکھتی ہے لاجواب شعر ہے۔ اسی مضمون کو غالب نے یوں بھی کہا ہے ؎

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے
آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے

---

(۵۸)

نرگس ایک عمر سے معذور تماشا یعنی اندھی ہے۔ لیکن شبنم کی آنکھ میں آج تک کوئی کانٹا نہیں ٹوٹا یعنی اس کی بینائی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ فطری معذوریوں اور صلاحیتوں کی طرف اشارہ ہے۔

---

(۵۹)

حسن خود آرائی تغافل کی مشق کر رہا ہے یعنی ابھی پورے طور سے آراستہ ہو کر جلوہ نما نہیں ہوا ہے۔ مشاطہ اسے پھولوں کے آئینے دکھا کر اس کا نکھار مکمل کرا رہی ہے۔ کائنات کے ارتقا کی طرف اشارہ ہے۔

اسی مضمون کا ایک اور شعر ہے:۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

آخر الذکر شعر کی اس قدر شرحیں لکھی گئی ہیں کہ میرا کچھ مزید لکھنا لاحاصل ہوگا میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ شعر زیر بحث آخر الذکر شعر سے بھی زیادہ بلیغ اور لطیف ہے۔

---

(۶۰)

پھول کا حوصلہ جب تک کہ وہ کلی ہے دل تنگ یا کم ہمت ہے کیونکہ اس کو ابھی چاک گریبانی میں تامل ہے کلی چاک گریبانی کے بعد ہی پھول بنتی ہے۔

یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب تک وہ کلی رہتا ہے حوصلہ گل دل تنگ یا رنجیدہ رہتا ہے کیونکہ کلی کو چاک گریبانی یا کھل جانے میں تکلف ہوتا ہے اور حوصلہ گل چاک گریباں ہو کر کھل جانا چاہتا ہے۔

(۶۱)

تیرا جلوہ دیکھ کر وہ حیرت زدہ اور ماؤف ہوگیا ہے چنانچہ اب خورشید قطرۂ شبنم میں اس طرح چھپا ہوا ہے جس طرح فانوس میں شمع! شاعر قطرہ شبنم میں آفتاب کی چمک دیکھ کر یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ وہ میرے معشوق کا جلوہ دیکھ کر اس قدر حیرت زدہ ہوگیا ہے کہ اب اپنے آپ میں مقابلہ کی تاب نہ پاکر پردہ پوشی کر رہا ہے۔

---

(۶۲)

یہ کون آیا جس کے استقبال کے لئے چمن بے تاب ہوا جارہا ہے؟ جنبش موج صبا سے گمان ہوتا ہے کہ خود باغ استقبال کے لئے آگے بڑھ رہا ہے جنبش موج صبا کو شوخی رفتار باغ خوب کہا ہے۔

---

(۶۳)

ایک نفس سے زیادہ معشوقوں کے کرم نے وفا نہ کی۔ انھوں نے مجھ پر جو نگاہ کی وہ افسوس اتنی جلد گذر گئی گویا اس کا محمل سفر کسی شرار پر بندھا ہوا تھا یعنی ادھر آئی ادھر گئی۔ غالب کے مخصوص انداز کا شعر ہے۔

---

(۶۴)

اے اسد ایک طرف شب فرقت کی صعوبتوں کا ڈر ہے جو عشق سے باز رکھنا چاہتا ہے لیکن دوسری طرف معشوق کی دل آویز زلفیں میرے لئے دام ہوس سے کم نہیں ہیں اور میں ان کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔

(۶۵)

مستی میں ایک ہی دفعہ جھومنے سے غنچے کی بزم درہم برہم ہو جاتی ہے غنچے کا مکان یا اس کی دنیا بہت تنگ ہے چنانچہ اسے ہوا کی خواہش نہیں کرنا چاہیئے مطلب یہ کہ انسان کو اپنے ظرف کا اندازہ کر کے کسی بات کی خواہش کرنا چاہیئے ورنہ ہوس کی زیادتی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔

---

(۶۶)

میں نے رسوم نیاز کے میدان میں خوب جگر کاٹے ہیں یعنی کافی تجربہ حاصل کیا ہے دشمن ہر جگہ ملتے ہیں اور دوست کہیں نہیں ملتا۔ چنانچہ اب تو بھی مجھے دشمن سمجھ لے اور مجھ سے کسی دوستی کی توقع مت رکھ۔ یہ جنس ناپید ہے۔
یہ بھی معنے ہو سکتے ہیں کہ میں بھی رسوم نیاز یعنی روایتی دوستی کرنیکا عادی ہو چکا ہوں۔ لہٰذا تو مجھے اپنا دشمن سمجھ کر مجھ سے کسی وفا کی توقع مت رکھ دنیا کی بے وفائی کا ذکر عجیب وغریب انداز میں کیا ہے۔ اپنے تلخ تجربوں کی بنا پر شاعر اپنے ساتھ کی گئی بے وفائیوں کا شکوہ کرنا تو لاحاصل سمجھتا ہے بلکہ اب اپنے دوست کو متنبہ کرتا ہے کہ تو مجھے اپنا دشمن سمجھ کر مجھ سے کسی وفا کی امید نہ رکھ تاکہ تجھے بھی میری طرح مایوسی سے دوچار نہ ہونا پڑے۔

---

(۶۷)

میرا شکوہ درد بنا۔ پھر یہ درد داغ بنا مطلب یہ کہ میں نے اس سلسلے میں بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں لہٰذا اے بے وفا مجھے معاف کر دے یا معذور سمجھ اگر میں نے اپنی تمناؤں کی ایک دنیا چھوڑ کر اس کے بدلے میں صرف تیرا خیال لے لیا ہے بہت

خوب کہا ہے۔ غالب کے مخصوص رنگ کا شعر ہے۔ شاعر اپنے معشوق کا محض تصور کرنے کے لئے اس سے معافی چاہتا ہے اور اپنی اس جرأت کی تاویل پیش کرتا ہے

---

(۶۸)

دیوانے اپنے دل کی حسرتیں بہار کے فروغ سے مٹاتے ہیں۔ شاخ گل میں پھول کو وہ اپنے معشوق کا پنجہ سمجھتے ہیں۔

---

(۶۹)

جگر کے ٹکڑے پلکوں تک کہاں پہونچ سکتے ہیں یعنی ہم جی بھر کر کہاں رو سکتے ہیں اگر نگاہ پھولوں کی قدرداں نہ ہو تو بڑے افسوس کا مقام ہے کیونکہ لخت جگر کا نعم البدل پھول ہی ہو سکتے ہیں۔ پھول ہی دیکھ کر ہم اپنے لخت جگر یاد کر سکتے ہیں

---

(۷۰)

تکلفات ظاہری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے میرے لئے دونوں جہان فراہم کر دیئے ہیں لیکن ان سب کے درمیان اس کی ایک نگاہ قہر آلود بھی ہے۔ مگر تکلفات کے اس ہجوم میں ہم اس کا کیا سراغ لگا سکتے ہیں۔ عجیب و غریب شعر ہے۔

---

(۷۱)

اس کا وفا کرنے کا وعدہ میری کس قدر دلبری کریگا یہ تو مجھے اچھی طرح معلوم ہے مطلب یہ کہ اس کا وعدہ کبھی ایفا نہ ہوگا۔ وہ روز وعدے کر کے مکر جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں جو اس کے وعدوں پر فریفتہ ہوں تو محض اس اشتیاق

میں کہ دیکھیں وہ اب کون سا دعدہ کرتا ہے اور اسکو ایفانہ کرکے میرے اوپر جفا کرنے کے لئے کون سا طرز انتخاب کرتا ہے۔ بڑا پر لطف اور بلیغ شعر ہے۔

---

(۷۲)

چونکہ ہم خود یار کے حسرت کش ہیں لہذا ہم تمنائے دیدار کے مخالف بن گئے ہیں ہم تمنائے دیدار کو نہیں بلکہ خود یار کو چاہتے ہیں۔ ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ چونکہ ہم اپنے یار کے لئے تڑپ رہے ہیں لہذا ہم ہر تمنائے دیدار کے رقیب یا حریف بن گئے ہیں۔

---

(۷۳)

بالآخر ہم سب کو فنا کے باغ میں پہونچنا ہے لہذا بے کار ہم زندگی میں دوڑے دوڑے اور مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک انگریزی مثل بھی ہے کہ تمام راستے قبر ہی کی طرف جاتے ہیں۔

---

(۷۴)

گلشن کا تماشا دیکھا اور کچھ پھولوں کو چننے کی تمنا کی۔ اے بہار آفرینا کیا اتنی ہی خطا پر ہم گنہگار ہو گئے؟ بے پناہ شعر ہے پوری زندگی کا خاکہ چند الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس دنیا میں انسان کرہی کیا پاتا ہے جس کے لئے اس کو سزا دی جاتی ہے۔

---

(۷۵)

ہم کو نہ ذوق گریباں ہے نہ پروائے گریباں۔ ہم تو چمن کے گل و خار کے

نگاہ آشنا یا ہم راز ہیں۔ ہمیں اپنی ظاہری آرائش سے کیا سروکار؟ ہم تو قدرت سے قریب تر رہنا چاہتے ہیں۔

---

(۷۶)

اسد میں جانتا ہوں کہ شکوہ کرنا کفر ہے اور دعا کرنا ناشکر گذاری ہے لیکن کیا کروں ہجوم تمنا سے لاچار ہو گیا ہوں۔

---

(۷۷)

جو جگہ سیلاب کی رہ گزر نہ ہو وہاں دیوانے آباد ہونے کی خواہش نہیں کرتے مطلب یہ کہ دیوانوں کو مصائب اور سختیاں جھیلنے میں لطف آتا ہے وہ اس جگہ آباد ہونا بھی پسند نہیں کرتے جہاں خطرات کا اندیشہ نہ ہو۔

---

(۷۸)

پھول کلی ہونے کی حالت میں بھی رنگ کے ایک دریا میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اے آگہی یا اے شوق دید فریب تماشا ہر جگہ موجود ہے۔ صرف دیکھنے کے لئے آنکھیں چاہئیں۔

---

(۷۹)

بڑے بڑے کام محض جنبش دل سے سرہو جایا کرتے ہیں۔ یہاں فرہاد کی حیثیت محض ایک پتھر کا کام کرنیوالے مزدور کی ہے۔ مطلب یہ کہ بڑے کاموں کی انجام دہی کے لئے جسمانی محنت اور مشقت کی اس قدر ضرورت نہیں ہوتی

جتنی کہ خلوص نیت یا طلب صادق کی۔

---

(۸۰)

صاحبان دولت کا احسان مند ہونا ہمیں ناگوار معلوم ہوتا ہے حتیٰ کہ زر گل یعنی گلاب کا زیرہ یا بیج بھی ہمیں جوہر فولاد معلوم ہوتا ہے۔ فولاد سے تلوار اور خنجر بنتے ہیں۔

---

(۸۱)

دیر و حرم تکرار تمنا کے آئینے ہیں — یعنی وہ ایک ہی طرح کی تمنا کے مظہر ہیں۔ انسان کے شوق کی کوتاہی نے ان کو اپنی پناہ بنا لیا ہے انسان کی منزل دیر و حرم سے کہیں آگے ہے۔ یہ اس کے شوق کی کوتاہی ہے کہ اس نے اپنے آپ کو انھیں تک محدود کر لیا ہے اور ان کو اپنی فصیل کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ دیر و حرم بظاہر جدا جدا چیزیں ہیں لیکن دراصل یہ انسان کی ایک ہی طرح کی تمنا کا نتیجہ ہیں۔ یہ تمنا اپنے شوق کو محدود کر لینے کی ہے۔ جنھوں نے دیر کو اپنا منتہائے مقصد بنایا یا جنھوں نے حرم کو اپنی زندگی کی معراج سمجھا انھوں نے محض اپنے شوق کی کوتاہی سے اس کو محدود کر لینے کی کوشش کی ہے ورنہ دراصل انسان کے شوق کی منزل دیر و حرم سے بہت آگے ہے۔ بے پناہ شعر ہے اور زبان بجا طور سے اس شعر پر فخر کر سکتی ہے۔

---

(۸۲)

میرے دل خونیں کے فشار کی کیا کیفیت پوچھتے ہو؟ اس ایک چھوٹی سی

کلی سے چاہوں تو سیکڑوں پھول کے جیسے ساغر نکال کر رکھ دوں! مطلب یہ کہ میرے اس چھوٹے سے دل میں نہیں معلوم کیسی کیسی رنگین تمنائیں بھری پڑی ہیں۔

---

(۸۳)

میں آنکھیں کھولے دیکھ رہا ہوں اور میرے سامنے نظر فریب گلشن موجود ہے لیکن کیا فائدہ؟ میں صرف تھوڑی ہی دیر کا مہمان ہوں شبنم کے اس قطرہ کی مانند جو کہ آفتاب دیکھ چکا ہو یعنی آفتاب کی گرمی سے بہت جلد خشک ہو جانے والا ہو غالب کا مخصوص رنگ ہے۔

---

(۸۴)

میری دوڑ دھوپ کا کوئی مقصد ظاہر نہیں ہوتا۔ میری مثال پانی کی موج ہے جو ہر وقت بے قرار رہتی ہے لیکن اس کی زبان کٹی ہوئی ہے یعنی وہ اپنا مقصد ظاہر نہیں کر پاتی۔ بہت خوب کہا ہے۔

---

(۸۵)

میں بے ہنر جوہر آئینہ تھا لیکن بے کار! زمانے نے میری کوئی قدر ہی نہیں کی اور میں دنیا کی نظروں کے لئے ایک چبھتا ہوا کانٹا بن کر رہ گیا ہوں یعنی جو کوئی میری طرف دیکھتا ہے فوراً آنکھیں پھیر لیتا ہے گویا میں اس کی نظر میں ایک کانٹا بن کر چبھ جاتا ہوں۔ لاجواب شعر ہے۔

---

(۸۶)

میں صرف اپنے حسین اور دلفریب تصورات کی بنا پر نغمہ سرا ہوں۔ میری مثال ایک ایسے بلبل کی ہے جو ایک ایسے چمن کی امید میں خوش ہو کر جو ابھی عالم وجود ہی میں نہیں آیا ہے۔

---

(۸۷)

وحشت کدہ امکان میں کسی دو چیزوں میں اتفاق چشم پایا جانا بہت مشکل ہے۔ رہا یہ کہ مہتاب اور آفتاب میں اتفاق چشم دیکھا جاتا ہے تو یہ محض ایک خواب پریشان کا فریب ہے دراصل اس کی کوئی حقیقت نہیں۔

---

(۸۸)

سایہ گل ایک داغ ہے اور بوئے گل ایک موج درد ہے چمن کی ظاہری گرمی بازار دراصل اس کی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ جن چیزوں کو سامان بہار سمجھا جا رہا ہے۔ وہ دراصل چمن کی تباہی کی نشان دہی کر رہی ہیں۔

۸۹

چمن دیدار خوباں کے لطف سے بیگانہ محض ہے صبح کو چمن میں نرگس کے پھول جیسے کور چشم ملا کرتے ہیں یعنی چمن کو دیدہ بینا میسر نہیں ہے اقبال کا مشہور شعر ہے

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

---

(۹۰)

ہم نے جو تنہائی ترک کردی تو اپنے اس فعل کے لئے ہماری بے دماغی (آزاد روی ۔ لاابالی پن) کوئی تاویل نہیں پیش کرنا چاہتی ورنہ واقعہ تو یہ ہے کہ نفس کی آمد و شد خود ایک زنجیر رسوائی ہے ۔ مطلب یہ کہ جب خود زندگی باعث خواری ہو تو خلوت اور جلوت دونوں یکساں ہیں ۔ خلوت ترک کر دینے کے متعلق عذر خواہی کی ضرورت ہی نہیں ۔

---

(۹۱)

میرے لئے میرا ہر سانس ایک شعلہ پیمائی ہے ۔ یا رب کیا میرے دل کی یہ ساری تپش اور جلن بیکار محض ہے ۔ ؟ کیا مجھے کسی کو کبھی اس کا حساب نہیں دینا ہے ؟ پھر میرے لئے اتنا سخت امتحان کیوں تجویز کیا گیا ہے ؟ عجیب و غریب شعر کہا ہے ۔

---

(۹۲)

دنیا کے طلسم خانے میں پاداش عمل کی بنا پر سیکڑوں حشر برپا ہیں یعنی انسان کو اپنے ہر کام کی جزا یا سزا یہیں مل جاتی ہے ۔ اے غافل ہوشیار ہو جا یہاں کی ہر بات اپنا مستقبل رکھتی ہے بالفاظ دیگر بے نتیجہ نہیں ہوتی ۔ ہر عمل کی پاداش لازمی ہے اور وہ اسی دنیا میں ظاہر ہو جاتی ہے ۔

---

(۹۳)

اے اسد پھول کا سینہ کانٹے کی جفا سے چاک چاک ہے پھول کی پنکھڑیاں جو گر رہی ہیں ان سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی تیر کھایا ہوا پرندہ اپنے پر

پھڑپھڑا رہا ہو۔ کیا بے مثل تشبیہہ دی ہے۔؟

---

(۹۴)

اگر نظارہ کرنا چاہتا ہے تو اس کی دعوت کے لئے شمع کا ایسا دل لائینی نگاہ اشک سے لبریز اور سینہ تمنا سے معمور ہونا چاہئیے۔ مطلب یہ کہ نظارے کیلئے طلب صادق شرط ہے۔

---

(۹۵)

خدایا تو اسد کی محفل کو وہ گرمیٔ تماشا عطا کردے کہ اس میں سوائے شمع کافوری کے اور کوئی دل سرد نہ دکھائی پڑے۔

شمع کافوری کو محض لفظی رعایت سے دل سرد کہا ہے ورنہ در حقیقت وہ بھی سرد نہیں ہوتی۔

---

(۹۶)

میں اپنی نظر کے دام میں وہاں پر فشاں ہوں جہاں صبح بہار رنگ و بو کا قفس نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ میری نظر اس بلندی پر فائز ہے کہ یہاں صبح بہار بھی رنگ و بو کی محتاج نہیں ہے۔ بڑا بلیغ اور پر معنی شعر ہے۔

---

(۹۷)

بے درد لوگ ملامت کرکے جو تسکین دینا چاہتے ہیں اس کا حاصل سوائے درد کے اور کچھ نہیں ہے۔ دکھانے کے لئے وہ ہمدردی میں روتے ہیں لیکن اس

رونے میں سیکڑوں طنز آمیز قہقہے پوشیدہ ہوتے ہیں۔

---

(۹۸)

موتیوں کی سیکڑوں لڑیاں ان بتوں کی تمکنت پر قربان ہوتی رہتی ہیں کہ جن کے رخساروں پر پسینہ بھی مشکل ہی سے آتا ہے۔
پسینے کے قطروں کو موتیوں سے تشبیہ دی ہے اور ان کے چہرے پر رواں ہوتے یا غائب ہونے کو قربان ہونے کے مترادف قرار دیا ہے۔

---

(۹۹)

میرے دل کا ہر تازہ داغ مثل ایک دل کے ہے جو کسی نئے داغ کا انتظار کر رہا ہے ایسی صورت میں تو میرے درد کا امتحان لینے والے سینے کی فضا کی وسعت کیا پوچھتا ہے؟ اس میں گنجائش کی کمی کیسے ہو سکتی ہے اس کا ہر داغ ایک نئے داغ کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ دل داغ انتظار اور سینہ درد امتحاں خوب کہا ہے۔

---

(۱۰۰)

دنیا میں کوئی شخص ایک دوسرے کے باطن سے واقف نہیں ہے درحقیقت ہر انسان ایک نہ پڑھے ہوئے صفحے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بڑا باریک نفسیاتی نکتہ پیش کیا ہے۔

---

(۱۰۱)

ارباب فنا یعنی برگزیدہ لوگ چھپ کر شراب پیتے ہیں۔ پیمانے میں شراب کا

Scanned with CamScanner

لرزتا ہوا خط انھیں برگزیدہ لوگوں کا نفس دزدیدہ معلوم ہوتا ہے۔ انسان جب کوئی کام چھپ کر کرتا ہے تو خوف کی وجہ سے وہ رک رک کر سانس لیتا ہے خط پیمانہ کی لرزش دیکھ کر شاعر کو خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہو نہ ہو یہ برگزیدہ لوگوں کا نفس دزدیدہ ہے۔

---

(۱۰۲)

کبھی تو جنت کی امید ہے اور کبھی جہنم کا خوف اس طرح خدا کی یاد میں کلفت ماسوا یعنی دنیا داری اور خود غرضی بھی شامل ہے۔ جو لوگ محض جنت کی امید یا جہنم کے خوف سے عبادت کرتے ہیں ان پر طنز کیا گیا ہے۔

---

(۱۰۳)

اے حسن کے ظاہری تکلفات کے دھوکے میں آکر اپنے عشق کو آزمائش میں مبتلا کرنے والے! تو بیکار اپنے شوق کو تکلیف دیتا ہے معشوق کا ناز خود ایک التجا ہے۔ مطلب یہ کہ حسن کا ناز خود ہی ایک دعوت ہے پھر اس کے لئے کوئی غیر ضروری زحمت کیوں برداشت کرے؟

---

(۱۰۴)

حسن اور عشق کی شوخیاں ایک دوسرے کا جواب ہیں اگر کانٹا بے نیام ہے تو ہم بھی برہنہ پا ہیں۔

بالفاظ دیگر اگر حسن کو ستم کرنے کا شوق ہے تو ہم کو بھی ستم برداشت کرنے کا حوصلہ ہے۔

میرے پاس نہ تو تیری تمنا کرنے کا کوئی ساز و سامان ہے نہ مجھ سے اور تجھ سے گفتگو کی کوئی راہ اور رسم ہے۔ پھر اے خلق کے دل و جان! تیرا کیا ہرج ہے اگر تو ہم کو محض اپنا ایک جاننے والا سمجھ لے۔ بڑا حسرت انگیز شعر ہے۔ دل و جان خلق کے معنی سراپا اخلاق یا زمانے بھر کے منظور نظر۔

---

(۱۰۶)

ہر چند کہ ساری عمر آزردگی میں کٹ گئی لیکن جس طرح میرا شکوہ ناتمام ہے اسی طرح میرا شوق بھی ساری عمر مایوسیوں میں بسر ہوئی میں اپنی محرومیوں کا جی بھر کر ماتم بھی نہیں کر سکا لیکن اس کے باوجود میرے شوق کے ارمان پورے نہ ہوئے لیعنی نئی نئی تمنائیں پیدا ہی ہوتی رہیں۔ بہت خوب کہا ہے۔

---

(۱۰۷)

آج چمن میں یہ کس کی بزم تماشا برہم ہو گئی ہے؟ چنبیلی کی پتیاں شیشے کے ان ٹکڑوں کی طرح دکھائی پڑتی ہیں جو عموماً کسی محفل نشاط کے اجڑ جانے کے بعد اس کی یادگار رہ جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ چنبیلی کی زمین پہ گری ہوئی پتیاں اس بات کی نشان دہی کر رہی ہیں کہ بہار ختم ہو چکی ہے۔

---

(۱۰۸)

جب تک دل بینا نہ ہو لالہ زار کی سیر کی تمنا نہ کر۔ لالہ زار صحیفہ قدرت کا ایک ورق منتخب ہے۔ مطلب یہ کہ لالہ زار میں انسان جو کرشمۂ قدرت دیکھتا ہے اس سے وہ دل بینا کے بغیر لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔

---

(۱۰۹)

شعلے کے ایسے سرخ چہرے والے معشوقوں نے شراب پینے میں جو گرم جوشی دکھائی اس کا میں کیا حال بتاؤں؟ انھوں نے اپنے دل کی شمع کو شراب کی آگ سے روشن کر رکھا تھا۔ یا انھوں نے میرے دل کی آتش شوق کو شراب سے بھڑکا دیا تھا۔

---

(۱۱۰)

ساقی کے لطف پر نازاں ہونا رندوں کی بے باکی پر ایک نشہ کا کام کر رہا ہے چنانچہ گناہوں کی وجہ سے ان کی جو تر دامنی ہے اس میں موج کوثر کی طراوت آگئی ہے یعنی گناہوں میں امید رحمت بھی شامل ہو گئی ہے ساقی سے مراد ساقی کوثر ہیں۔ شفاعت کی امید سے گنہگاروں کی بے باکیاں اور بڑھ گئی ہیں چنانچہ اب ان کی تر دامنی میں موج کوثر کی طراوت شامل ہے۔

ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ لطف ساقی کی شہ سے مستوں کی بے باکی پر ایک نشہ سا چڑھ گیا ہے چنانچہ اب وہ اپنی تر دامنی کو طراوت موج کوثر یعنی ثواب سمجھتے ہیں انھیں اعتماد ہے کہ انکی گنہگاری ہی ان کے لیے موجب شفاعت بنے گی۔

---

(۱۱۱)

معشوق کا ناز خود بینی اسے عاشق نوازی سے روکتا ہے اور تکلف برطرف صاف بات یہ ہے کہ معشوق اور عاشق کے درمیان آئینہ حد فاصل کا کام دے رہا ہے یعنی معشوق کا محض یہ احساس کہ وہ اس قدر حسین ہے اسے اپنے عاشق سے دور کر رہا ہے۔

---

(۱۱۲)

میں ایسی کمینگاہ تغافل میں گرفتار رہوں جہاں میری قوت بہ دانہ صیاد کی نیند سے زیادہ گہری نیند میں سو جانے کی متمنی ہے۔ مطلب یہ کہ میں ایسے تغافل کا شکار رہوں کہ اس نے اپنے سے زیادہ خود مجھے غافل کر دیا ہے۔ اپنی نوعیت کا بہترین شعر ہے۔

---

(۱۱۳)

میری عمر جو فرصت کی تلاش میں رہتی ہے میرے لیے سست رفتاری کا باعث بن گئی ہے۔ اس کے ساتھ چلنا میرے لئے ایسا ہی ہے جیسے مجھے کسی آہو کے ساتھ زنجیر سے باندھ دیا جائے۔ میری رفتار رم آہو سے کہیں زیادہ ہے لیکن ساتھ باندھ دیئے جانے کی وجہ سے اب مجھے اس کے ساتھ رفتار ملا کر چلنا پڑ رہا ہے۔ میں اپنی زندگی کی مسافت بہت تیزی سے طے کر ڈالنا چاہتا ہوں لیکن میری عمر جو فرصت کی تلاش میں رہتی ہے وہ میری درماندگی یا میرے پیچھے پڑے رہ جانے کا باعث ہے۔ میرا اور میری عمر کا ساتھ ایسا ہی ہے جیسے کسی تیز رفتار کو کسی سست رفتار کے ساتھ باندھ دیا جائے۔

---

(۱۱۴)

گردش میں رہنے کے نشے کا سرور اگر اپنی کیفیت ظاہر کر دے تو پھر جنگل کے ہر بگولے میں ایک جام سفالی نظر آنے لگے۔ بگولہ گردش میں رہتا ہے اور اسکی صورت جام کی سی ہوتی ہے۔ گرد کی رعایت سے اسے جام سفالی کہا گیا ہے۔

---

(۱۱۵)

معشوقوں کا قد سر سے پیر تک انتہائی نشہ کی کیفیت پیدا کرتا ہے اس کی وجہ ان کی دل ربائی ہے نہ کہ ان کی طویل قامتی۔ طویل قامت تو سرو بھی ہے لیکن وہ محض ایک مینائے خالی نظر آتی ہے اور اس سے کوئی نشہ نہیں پیدا ہوتا۔

---

(۱۱۶)

اسدؔ کسی دولت مند کی خرد ماغی پر تعجب نہ کر۔ یہ نامرد محض قالین کے میدان کا شیر افگن ہے۔ دولت مند نہ صاحب دل ہوتا ہے نہ صاحب ہنر وہ تو قالین پر بیٹھ کر محض شیخی بگھارنا جانتا ہے۔ اس سے اس کے علاوہ توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔

---

(۱۱۷)

اہالیان باغ ایک دوسرے کے غم میں شریک رہتے ہیں۔ چنانچہ اگر گل شہید ہوا تو اس کے ماتم میں لالہ کسی بجھے ہوئے چراغ کی چشم حسرت آلود دکھائی پڑتا ہے۔

---

(۱۱۸)

اب نہ کسی شراب کی ضرورت ہے نہ کسی عرق کی خواہش۔ نشے کو اپنے عروج پر پہونچانے کے لئے ایک بہت ہی پر کیف سامان ہو گیا ہے اور وہ یہ کہ خطِ رخسار ساقی سے خط ساغر تک ایک چراغاں کی سی کیفیت معلوم ہو رہی ہے۔ اس ہوش ربا منظر کے بعد اب اور کیا چاہئیے ؟

---

(۱۱۹)

اے غافل تیری رعنائی کی شرم یعنی تیرا بناؤ سنگھار تیرے لئے اور بھی رسوائی کا سامان پیدا کررہی ہے۔ تو نے ہاتھ میں مہندی لگا رکھی ہے لیکن یہ آرائش اس بات کی غمازی کررہی ہے کہ تو نے عاشق کا دل خون کردیا ہے۔

---

(۱۲۰)

اسد اطمینانِ قلب آغوش بے خودی ہی میں نصیب ہوسکتا ہے کیونکہ دونوں جہاں کا علم وفضل ایک خواب پریشاں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا اسکو حاصل کرنے کی خواہش بے سود ہے۔

---

(۱۲۱)

وقت اس افتادہ کا خوش ایک فارسی محاورے کا ترجمہ ہے اردو میں اس کے یہ معنی ہوسکتے ہیں کہ وہ بڑا اچھا! یا اس پر خدا کی رحمت! یا اسے شاباش جو قانع رہ کر اسد چیونٹی کے نقش پا کو تخت سلیمانی سمجھے۔ یعنی زمین پر پڑے رہنے ہی کو تخت سلیمانی پر بیٹھ جانے کا مترادف سمجھے۔

---

(۱۲۲)

تیری وجہ سے ایک شعلہ شوق بھڑک اٹھا ہے چنانچہ اب میں چراغوں سے جلتے ہوئے شہروں کے مقابل پر جل رہا ہوں تو ایک شعلہ بھڑکا کر آگ ہوگیا اور اب مجھے ہزاروں شعلوں کا مقابلہ کرنا پڑرہا ہے بہت خوب کہا ہے۔

---

(۱۲۳)

وصل میں بھی میرا دل ایک عجیب انتظار کر رہا ہے غالباً وہ کسی ایسے فتنے کا متمنی ہے کہ جو اس کی تمنا کو تاراج یا تباہ و برباد کر دے گا۔ لاجواب شعر ہے شاعر نے نفسیات کا ایک بڑا بصیرت افروز نکتہ واضح کیا ہے۔ انسان کو محض حصول مقصد سے طمانیت قلب حاصل نہیں ہوتی۔ اطمینان اور بے اطمینانی کیفیات انسان کے طریقۂ فکر اور زاویہ نگاہ کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ میرے دل کو وصل بھی نصیب ہوا تو اب بھی وہ مطمئن نہیں ہے اور کسی نئی مصیبت کا انتظار کر رہا ہے یعنی اتنی بڑی نعمت پانے کے باوجود وہ بدستور پریشان اور مضطرب رہنا چاہتا ہے۔

---

(۱۲۴)

معشوق نے تغافل کا مسلک اختیار کیا ہے اس سے ہر بات ادھوری رہ گئی ہے۔ معشوق کی نگاہ ناز بھی مینا کا ایک خط ہے جو یہ ظاہر کرتا ہے کہ مینا لبریز نہیں ہے یعنی معشوق کی پوری توجہ میری جانب نہیں ہے بلکہ تغافل کی وجہ سے اس میں ابھی بہت کمی ہے۔

---

(۱۲۵)

خواہ آبادی ہو خواہ ویرانہ میری نگاہ ہر طرف حسرتیں پیدا کرتی رہتی ہے میں جس طرف بھی آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں مجھے صحرا کا ایک ٹکڑا ہی نظر آتا ہے انسان کی مایوسیاں یا مسرتیں بیشتر داخلی اسباب کا نہ کہ خارجی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ چونکہ میری نگاہ میں حسرتیں بھری ہوئی ہیں۔ لہٰذا میں جس منظر کو بھی دیکھتا ہوں

وہ مجھے حسرت انگیز نظر آتا ہے بڑا البصیرت افروز شعر ہے اور اس میں ایک نفسیاتی حقیقت بیان کی گئی ہے۔

---

(۱۲۶)

بہار کا زمانہ بڑی تیزی سے گذر جاتا ہے گویا کہ بہار خوشبو کے تیز گھوڑے پر سوار ہے اور ایک ایک پھول کا کھلنا اس کے لیے سو مہمیز دل کا کام کرتا ہے۔ یعنی اس سے اس کی رفتار اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔ بہت خوب کہا ہے۔

---

(۱۲۷)

اپنی ہستی کو دوسرے کے ہاتھوں بیچنا یعنی محض لالچ کی خاطر اپنی زندگی کو دوسرے کی مرضی کے مطابق بسر کرنا ایک مضحکہ خیز بات ہے! اور اس سے دل کے ٹوٹنے پر ہنسنے کی آواز پیدا ہوتی ہے مطلب یہ کہ دل کے ٹوٹنے کی صدا در اصل اس بات پر ایک تمسخر ہوتی ہے کہ تو اپنی زندگی دوسروں کے لئے وقت کر چکا ہے۔

---

(۱۲۸)

میں تو ہمیشہ کے واسطے سراپا حیرت بن چکا ہوں یعنی مایوس ہو چکا ہوں مگر میرا ذوق خیال مجھے معشوق کی نگاہ ناز کی امید دلا دلا کر پریشان کرتا رہتا ہے۔

---

(۱۲۹)

ہر ایک سے عشق کرنے کا لطف نئے تجربات کا حامل ہوگا لہذا ایک نگاہ آشنا بن کر رہ جائیے مطلب یہ کہ ہر انسان سے محبت کیجئے ہر ایک سے نیا لطف حاصل ہوگا۔

(۱۳۰)

مجبوری میں حوصلہ بے اختیار ریا بیکار ہو جاتا ہے۔ سیکڑوں کفن کے دامن پتھر کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔ دامن کا پتھر کا نیچے دبا ہونا مجبور اور لاچار ہو جانے کے معنوں میں آتا ہے۔ مطلب یہ کہ جو لوگ خاک میں مل گئے جب وہ زندہ تھے تو ان کے بڑے بڑے حوصلے تھے لیکن اب وہ مجبور محض ہیں۔

---

(۱۳۱)

جس طرح راستہ دیکھ کر مجھے زنجیر یاد آجاتی ہے جو میں کبھی پہن کر اس پر چلا تھا اسی طرح اس کی آنکھ دیکھ کر مجھے اس کی وہ نگاہ لطف یاد آجاتی ہے جو مجھ پر کبھی پڑی تھی۔ بہت خوب کہا ہے۔

---

(۱۳۲)

ہم نے دنیا کو اپنی کاہلی سے ترک کر دیا۔ اس سے ہمیں کچھ بھی حاصل نہیں ہوا مطلب یہ کہ اگر ہم نے قناعت کے باعث دنیا چھوڑی ہوتی تو ہمیں کم سے کم اطمینان قلب تو نصیب ہو جاتا لیکن ہم نے تو دنیا محض اپنی کاہلی سے چھوڑ دی ہے ہماری خواہشات ہم کو اب بھی پریشان کرتی رہتی ہیں۔

---

(۱۳۳)

خدا تو اپنے بندوں پر باپ سے زیادہ مہربان ہے۔ ہم جو در بدر پھرے تو خدا کی ناراضگی سے نہیں بلکہ اپنی بے ہنری کے باعث۔ اس شعر میں قدرت پر ایک بلیغ طنز بھی پنہاں ہے۔

میرا جنون افسردہ پڑ گیا اور جان ناتواں ہو چکی۔ اے جلوہ حسن یار اب تو اپنی شوخی دکھا۔ آخر میرے انتظار کی کوئی حد بھی ہے۔ میری خودداری کی ساری عمر تیری رعنائی کے انتظار میں گذر گئی اور پھر بھی محروم ہی رہا۔ استقبال کے لیے عموماً آگے بڑھ جاتے ہیں، عمر کا استقبال کے لئے آگے چلا جانا بہت خوب کہا ہے۔

---

(۱۳۵)

ارباب غفلت کی آسائش پر اے اسد مجھے رشک آتا ہے غفلت یا ناواقفیت کی وجہ سے وہ کسی بات کی فکر ہی نہیں کرتے اور آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں واقف کار لوگ دنیا بھر کے اندیشوں اور افکار میں مبتلا رہتے ہیں اور ان کا دل پیچ و تاب میں مبتلا رہتا ہے۔ اسی کے مترادف ایک انگریزی مقولہ بھی ہے۔

---

(۱۳۶)

تیری زلفوں کی آب و تاب کا عکس تیرے جسم میں سما گیا ہے اے ظالم تیرا سیاہ رنگ کس قدر زنگ سے بھرا ہوا ہے۔ شعر میں کسی ایسے معشوق کی تعریف کی گئی ہو کہ جو سیاہ فام تھا، سیاہ فامی کی تاویل بہت خوب پیش کی گئی ہے۔

---

(۱۳۷)

اپنے جلوہ کو جلد گردش میں لا یعنی آشکار کر دے تاکہ وہ مشتاقان دید کے لئے صد ساغر تسلی ثابت ہو۔ میری آنکھ جو پہلے ہی سے حیرت زدہ ہے تیری ہر ادا پر

مخمور ہے۔

---

(۱۳۸)

جنت حضرت آدم کے لئے تخلیق کی گئی تھی لہذا اولادِ آدم کے علاوہ اس کا کوئی دوسرا وارث ہو ہی نہیں سکتا۔ زاہد کا یہ خیال کہ وہ اپنی عبادت گزاری سے اس کو حاصل کرلے گا محض اس کی ناسمجھی ہے۔ جب ایک چیز کے ہم قدرتی وارث ہیں تو پھر اس کے لیے اتنی جد و جہد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

---

(۱۳۹)

طاؤس خاک اپنے ذروں کی چمک دمک کی بنا پر مجھے ایک ایسا معشوق معلوم ہوتا ہے جو نظر بازی کر رہا ہے چنانچہ خاک کا ہر ذرہ مجھے نگاہ ناز کا ایک اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ میرے لئے خاک کا ہر ذرہ قدرت کاملہ ایک اشارہ یا بالفاظ دیگر ایک پیغام ہے۔ بڑا بلیغ اور پر لطف شعر ہے خاک کے رنگ برنگ ذروں کی بنا پر طاؤس خاک کہا ہے۔

---

(۱۴۰)

محیط دہر میں یعنی دنیا کے سمندر میں نشو و نما پا کر ترقی کرنا فنا ہو جانے کے مترادف ہے۔ یہاں جو کوئی بھی آتا ہے حباب کی طرح شکست آمادہ آتا ہے۔ حباب جب بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو ٹوٹ جاتا ہے یہی کیفیت انسان کی ہے اس کا کمال اس کے زوال کے لیے دعوت ہوتا ہے۔

(۱۴۱)

خبر نگاہ کو اطلاع نہ دے اور نگاہ آنکھ کو دشمن سمجھ کر اس سے کبھی راز رکھے تو مجھے اپنا ایسا جلوہ دکھا کر اس کی خبر خود مجھے اور تجھے کبھی نہ ہو۔ مطلب یہ کہ میرے اور تیرے درمیان من و تو کا کوئی تفاوت باقی نہیں رہنا چاہیئے۔ بہت خوب کہا ہے۔ غالب کا مخصوص رنگ ہے۔

---

(۱۴۲)

میرا نفس میرے نالے کا رقیب بنا ہوا ہے اور میری آنکھ کو میرے آنسوؤں سے بیر ہے یعنی میں بہت سی متضاد الجھنوں میں مبتلا ہوں تو میری ظاہری حالت دیکھ کر میرے کرب اور اضطراب کا جو اندازہ لگتا ہے اس سے دراصل میرا کرب اور اضطراب کہیں زیادہ ہے۔

---

(۱۴۳)

یہ تو ممکن ہی نہیں کہ میری خاموشی کبھی حرف تمنا زبان پر لا سکے گی۔ اب اس پر میری حالت ظاہر ہونے کا واحد ذریعہ یہی رہ گیا ہے کہ وہ خانہ برانداز میری خاموشی ہی کو میری گفتگو سمجھ لے۔ یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ میں تو حرف تمنا زبان پر لاتا نہیں لیکن چونکہ میری خاموشی سے میری حالت ظاہر ہو جاتی ہے لہذا وہ خانہ برانداز مجھ پر گفتگو کرنے کا الزام لگاتا ہے۔

---

(۱۴۴)

معشوق کی آنکھ کی شوخی فتنہ ایام ہے یعنی اس کو قرار یا استقلال نہیں چنانچہ

رقیب کی قسمت گردش صد جام بن کر رہ گئی ہے مطلب یہ کہ کبھی اس کا ایک جام آتا ہے اور کبھی نہیں آتا۔ پھر آتا ہے اور پھر نہیں آتا۔ وہ کبھی مرکز لطف بنتا ہے اور کبھی نشانہ ستم

یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ معشوق کی آنکھ کی شوخی زمانہ بھر کا ایک فتنہ ہے رقیب پہ مہربان ہو گیا ہے تو بس اس کی قسمت میں سیکڑوں جاموں کی گردش آگئی ہے یعنی اس پر لطف و کرم کی حد کر دی ہے۔

(۱۴۵)

جلاد فلک ایک عالم کو قتل کر ڈالنے پر تلا ہوا ہے۔ موج شفق میں جو کہکشاں چھپی ہوئی ہے وہ دراصل تیغ خون آشام ہے۔ ایک انگریزی مقولہ ہے کہ قدرت کے ناخون اور پنچے خون سے بھرے ہوئے ہیں۔ شاعر بھی انسان سے قدرت کی بے رخی بلکہ دشمنی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

(۱۴۶)

اے اسد جہاں وہ خورشید رو ساقی جلوہ افروزی کرے وہاں سورج کی کرن بھی خط جام کا کام کرتی ہے۔ یعنی معشوق کے حسن کی بدولت ہر چیز پر کیف اور نشاط افزا بن گئی ہے۔ خورشید اور شعاع۔ ساقی اور خط جام میں رعایت لفظی ہے

(۱۴۷)

ضبط کا پابند ہو کر پانی کا ایک ناچیز قطرہ گوہر بن جاتا ہے اور عزت و

تو قیر پاتا ہے ورنہ یوں تو سمندر میں بے شمار قطرے ہیں جو چشمِ پرنم کی طرح مایوس اور مضطرب نظر آتے ہیں۔ جو قطرہ اپنے آپ کو پابند ضبط کرلیتا ہے اور صدف میں پہونچ جاتا ہے وہ مدارج اعلیٰ حاصل کرلیتا ہے اور جو قطرے ایسا نہیں کرتے وہ بے کار رواں دواں اور حسرت نصیب رہتے ہیں۔

---

(۱۴۸)

حسینوں کی صبا خرامی یعنی صبا جیسی چال یا صبا کے لئے تفریح، بہار کے سامان پیدا کر رہی ہے ایسی صورت میں لے غافل ناممکن نہ سمجھ اگر تیرا غنچہ دل بھی شگفتہ ہو جائے۔ صبا کی رعایت سے غنچہ دل کہا ہے۔

---

(۱۴۹)

عاشق کے اس دعوے کا کہ چاندنے میرے معشوق کے کفِ نگاریں سے حنا چرائی ہے شفق ایک گواہ رنگیں ہے۔ پورا شعر خوشنما الفاظ کا ایک گلدستہ ہے ورد حنا اس سفیدی کو کہتے ہیں جو مہندی لگاتے وقت سہواً ہاتھ میں رہ جاتی ہے۔ اس مفہوم سے شعر اور رنگین پر لطف ہو جاتا ہے۔

---

(۱۵۰)

دام گاہ عجز میں یعنی اس دنیا میں کہ جو پابندیوں کا ایک جال ہے آسائش کا سامان کیسے مل سکتا ہے۔ یہاں جو لوگ پر پھڑ پھڑاتے ہیں بالفاظ دیگر شہرت اور دولت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ محض اپنے نفس آسودہ کو دھوکا دیتے ہیں دراصل ان کی کوششوں کا نتیجہ کچھ بھی نہیں ہے۔ غالب کا مخصوص

رنگ ہے بہت خوب کہا ہے۔

---

(۱۵۱)

پرواز کی آمادگی کی کشمکش بڑی جان لیوا ہے، پر نہ کھولے جائیں یعنی اڑنے کی کوشش ہی نہ کی جائے یہی سرمایہ عافیت ہے سعدی کا مشہور شعر ہے ؎

بدریا اگر منافع بے شمار است   اگر خواہی سلامت برکنار است

---

(۱۵۲)

بہار کے موسم میں دیوانوں کی سرخ آنکھیں پھولوں کے نظارے کی دولت سے اور بھی سرخ ہو جاتی ہیں۔ اور مثل شفق کے معلوم ہونے لگتی ہیں۔

---

(۱۵۳)

فرصت یعنی زندگی ایک آئینہ ہے جس میں خود آرائی کے سیکڑوں طرح کے جلوے کارفرما ہیں لیکن ان کے بقدر شوق تماشا کرنے کا وقت کہاں؟ دن اور رات تماشائی کے کف افسوس معلوم ہوتے ہیں۔ دن کو ایک ہاتھ اور رات کو دوسرا ہاتھ مان کر ان کے باہم گذرنے کو کف افسوس ملنا کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔

---

(۱۵۴)

شمع کی طرح مجھے نہ کسی دعوی کرنے کا دماغ ہے اور نہ پائے ثبات ہی میسر ہے میرے ایک صبر کے دامن پر سیکڑوں شعلے بھڑک رہے ہیں۔

(۱۵۵)

اسدؔ اپنے عجز کی وجہ سے خاک ہو کر رہ گیا ہے۔ غضب ہے اگر اس عاجزی کے باوجود وہ غبار خاطر احباب ہو جائے یعنی اس کے احباب اس سے ناراض ہو جائیں۔ خاک کی رعایت سے غبار استعمال کیا ہے۔

---

(۱۵۶)

اپنے صفحہ ہستی کو حتی الوسع سادہ رکھئے لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو سکے تو سوائے خط عجز کے اس پر کوئی نقش تمنا نہ کھینچئے۔ مطلب یہ کہ دنیا میں کسی بھی چیز سے واسطہ اور سروکار نہ رکھئے اور اگر ایسا نہ ہو سکے تو عاجزی اور قناعت پر تکیہ کیجئے اور آرزوؤں اور تمناؤں سے دور رہیئے۔

---

(۱۵۷)

لباسی دوستوں یعنی محض دوستی کا لباس پہنے ہوئے لوگوں سے ملنا مجھے ناگوار ہے۔ ان سے ملنا ایسا ہی ہے جیسا کہ دیبا پر صورتیں بنانا یعنی دیکھنے میں پر تکلف اور دیدہ زیب لیکن در حقیقت بے جان اور بے کار محض۔ نمائشی دوست دیبا کی صورتیں ہیں ان کو دیکھ کر جی بہلا لیجئے لیکن ان کو انسانیت اور ہمدردی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

---

(۱۵۸)

اے شمع ہم جانتے ہیں کہ تیری مشق وفا صرف اسی وقت تک ہے جب تک کہ تیرا پیر لڑکھڑاتا نہیں۔ تجھے دعوئے ثابت قدمی کس بات پر ہے؟ ادھر تیرے

پیر کو لغزش ہوئی اور، ادھر تو نے میدان دنیا چھوڑا۔ یہ حوصلہ تو صرف ہم عاشقان جاں باز کا ہے کہ میدان دنیا کو جیتے جی نہیں چھوڑتے!

---

(۱۵۹)

مجھے لذت وصل نہیں میسر ہوئی یعنی میری آرزوئیں پوری نہیں ہوئیں تو اس سے میرے ذوق و شوق پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اے میری حسرتوں کی فراوانی! مجھے تو اب بھی اپنی تمناؤں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ یعنی میں نے ابھی جی بھر تمنائیں کی ہی نہیں ہیں۔ لاجواب شعر ہے۔

---

(۱۶۰)

میری تمناؤں کی بہاریں تو خزاں کا شکار ہو چکیں البتہ میری حسرتناک آہ کی بدولت ایک ادھوری بہار باقی رہ گئی ہے۔ مطلب یہ کہ میرے نفس شرربار پر بھی کبھی کبھی بہار کا دھوکہ ہو جاتا ہے۔

---

(۱۶۱)

میری وجہ سے ایک ایک ذرہ سرشار تمنا ہو گیا ہے۔ نہیں معلوم میں کس کا دل ہوں (ہو سکتا ہے کہ خود قدرت کا) جو مجھے دو عالم کی ہر چیز سے متعلق اور وابستہ کر دیا گیا ہے۔ بڑا پر لطف اور بلیغ شعر ہے جس پر ذوق سلیم وجد کرتا ہے شاعر بلکہ انسان فریاد کرتا ہے کہ میرے فانی جسد خاکی کی بساط کچھ بھی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اتنے بڑے کارخانہ قدرت کی ہر بات سے میرا تعلق اور لگاؤ رکھا گیا ہے۔ خود مجھے نہیں معلوم ہے کہ میں کس کا دل ہوں جو اس قدر مشتاق اور

گرویدہ بنایا گیا ہوں اور میری تمناؤں سے ایک ایک ذرہ سرشار تمنا دکھائی پڑتا ہے یا میری تمنائیں ایک ایک ذرہ تک پہونچ گئی ہیں۔

---

(۱۶۲)

اے بے سروسامانی تو درحقیقت سامان فراہم کرنے کا ایک کاسہ گدائی ہے تو عریانی کی تاویل پیش کرکے نئے نئے لباس ایجاد کرتی ہے اکثر کسی چیز کے حاصل کرنے کا ذریعہ اسکی ضد پیش کرنا ہوتا ہے۔

---

(۱۶۳)

میری تپش کی پرواز محض ایک رنگ بن کر رہ گئی ہے یا میری پرواز رنگ کی تپش بن کر محدود ہو چکی ہے کیونکہ اس کے لئے گلزار کی فضا بہت تنگ ہے اے ذوق پرافشانی تو دل کے قفس ہی میں خون ہو جا تیرے لئے یہ دنیا بہت چھوٹی ہے۔

---

(۱۶۴)

میں تمناؤں کا گلزار ہوں اور تماشاؤں کا گلچیں یعنی دلدادہ ہوں لہذا اے اسد میرے نالے کسی ایسے بلبل کے نغمے معلوم ہوتے ہیں کہ جو زبان سے بھی واقف ہو۔

---

(۱۶۵)

نالہ بلبل نے تجھے خراب اور خندہ گل نے تجھے شہید کر دیا ہے۔ کیا اب بھی

تجھے اپنے مرتبے کا دعویٰ اور رسوائی کا خوف باقی ہے؟ مطلب یہ کہ جب تونے ایک عاشق مزاج دل پایا ہے اور نالۂ بلبل اور خندۂ گل سے متاثر ہو جاتا ہے تو پھر تجھے اپنے مرتبے کا دعویٰ اور اپنی رسوائی کا کیا خوف ہو سکتا ؟

---

(۱۶۶)

میری آرزوؤں کے ہزاروں قافلے موت کے صحرا میں پہونچ کر ختم ہو چکے لیکن اس کے باوجود میری حسرتوں کی محمل خود آرائی کے کاندھوں پر قائم ہے مطلب یہ کہ میری ہزاروں آرزوئیں نامراد ہو چکیں لیکن اس کے باوجود میری خود پرستی کی وجہ سے آئے دن نئی آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ غالب کے مخصوص رنگ کا شعر ہے اور بہت خوب ہے۔

---

(۱۶۷)

حوصلہ ساتھ چھوڑ چکا۔ شکوہ کرنے کی توفیق پیدا ہو گئی۔ دعاؤں میں شانِ عجز آ گئی۔ کیا اس حالت پر پہونچ کر بھی اے اسد تجھے اپنے متعلق کوئی گمان اور اپنی دانائی کے متعلق کوئی غرور باقی ہے ؟

---

(۱۶۸)

زبان تجھی سے طاقتِ گفتار کی بھیک مانگتی ہے کیونکہ خاموشی کو بیان کا پیرایہ تو ہی عطا کرتا ہے۔ یا یہ کہ تیرے حضور خاموشی بھی بیان کی حیثیت رکھتی ہے یعنی زبان پر حرفِ مطلب نہ بھی آئے تب بھی تو اس کو سمجھ لیتا ہے۔ یہ پوری غزل حمد میں ہے ۔

(۱۶۹)

افسردگی کے عالم میں افسردہ دل تجھی سے فریاد کرتے ہیں کیونکہ چراغ صبح کی بے نوری اور گل خزاں کی پژمردگی کا تو ہی ذمہ دار ہے۔ مطلب یہ کہ جب تیرے ہی ہاتھوں ہم محرومیوں کا شکار ہوتے ہیں تو پھر تجھ سے نہ فریاد کریں تو اور کس سے؟

---

(۱۷۰)

زندگی کو موت سے جو مقابلہ کرنا پڑتا ہے اس کا نظارا بہت ہی حیرت انگیز ہے حالانکہ تیرے بنائے ہوئے دستور کے مطابق مرنے والوں کا خون موت کے پاؤں کی حنا بنتا رہتا ہے۔ مطلب یہ کہ اگرچہ تو نے یہ مقدر کر دیا ہے کہ زندگی کے خاتمے سے موت کا فروغ ہو لیکن اس کے باوجود زندگی موت کے قابو میں نہیں آتی اور جس بے جگری سے اس کا مقابلہ کرتی رہتی ہے وہ انتہائی تعجب خیز ہے۔

---

(۱۷۱)

پری خود شیشے میں ہے لیکن اس کا عکس آئینہ میں دکھائی دے رہا ہے مطلب یہ کہ تو خود تو پوشیدہ ہے لیکن تیری جلوہ سامانیوں سے سارا عالم سرشار ہے اس بوالعجبی پر مشاطہ کی نگاہ حیرت زدہ ہو کر خوں فشاں ہو گئی ہے۔ مشاطہ کا کام آرائش حسن ہے۔ مطلب یہ کہ تیرا حسن از خود ایسا ہے کہ اس میں افزائش کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اسے تو دیکھ کر مشاطگی کے ہوش و حواس بھی بجا نہیں رہتے

---

(۱۷۲)

نالے اور فغاں میں تو اثر کا جادو پیدا کر کے اسے جس قدر موجب تسکین بناتا ہے اسے تو جانے دے نالے کی بہار اور فغاں کی رنگینی بھی تو تیرے ہی دم سے قائم ہے۔ اپنی نوعیت کا لاجواب شعر ہے۔ نالے اور فغاں میں تو جو اثر پیدا کر دیتا ہے اس سے قطع نظر ان سے جو لطف اور کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ وہ بھی میرے لیے بڑی چیز ہے اور یہ بھی تیری ہی دین ہے۔

---

(۱۷۳)

یہ تیرا ہی کرم ہے کہ جس نے ہوس کے آغوش میں چمن در چمن بھر دیئے ہیں اور امید تیرا ہی سہارا لے کر گلستاں کے تماشے میں محو ہے۔

اس شعر میں ایک بلیغ طنز بھی پوشیدہ ہے۔ ہوس پرستوں کو تو تو نے چمن کے چمن بخش دیئے ہیں لیکن میری امید جو کہ محض تجھ سے وابستہ ہے صرف دور سے چمن کا تماشا کر رہی ہے اور اس کی لطف اندوزی اسے ہنوز محروم ہے بقول اقبال ؎

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا

---

(۱۷۴)

ہم سے جو تیرا نیاز کا مطالبہ ہے وہ دراصل تیرا اپنی خود پرستی کا اعلان ہے ورنہ سجدہ کرنے والی جبیں بھی تیری ہے اور آستاں بھی تیرا ہے۔ مطلب یہ کہ جب تو ہر چیز پر حاوی اور قادر ہے تو پھر نیاز اور اظہار عبودیت کا کوئی سوال ہی نہ پیدا ہونا چاہیئے اور اگر پیدا ہوتا ہے تو یہ محض تیری خود پرستی کا

اظہار ہے اور کچھ بھی نہیں۔

یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں ہمارا نیاز محض ہماری خود پرستی کا اظہار ہے کیونکہ جبیں اور آستاں دونوں تیرے ہی ہیں۔ تیری ہی عطا کی ہوئی جبین کو تیرے آستانے پر جھکانا کون سی بات ہے تیری ہی دی ہوئی چیز کو تیرے سامنے رکھ دیا تو ہم نے خود کون سا کارنامہ انجام دیا۔ اس سے صرف اپنی خود نمائی کی اور بس بقول عرشی صاحب یہ شعر وحدۃ الوجود کے متعلق ہے یعنی جب عابد اور معبود ایک ہی ہیں تو پھر عبادت خود پرستی نہیں تو اور کیا ہے ؟

---

(۱۷۵)

تیری رحمت اپنی کارفرمائی کے لیے کسی بہانے کی تلاش میں رہتی ہے تو ہی گناہ کرنے کا حوصلہ اور تو ہی گناہ کرنے کی سزا دیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اپنا کرشمہ دکھلانے کے لیے تیری ہی رحمت پہلے گناہ کرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے اور پھر ان کے عذاب میں مبتلا کرتی ہے۔

---

(۱۷۶)

بہار کا موسم ہے اور اسد قفس کے گوشے میں قید پڑا ہے۔ تجھی نے طاقت خرام عطا کی تجھی نے صبا بنائی۔ تجھی نے گلستاں بنایا۔ بے چارے اسد کے لیے آخر ان کا کیا مصرف ہے۔ اس کو بھی ان نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع عطا کر عجیب و غریب شعر کہا ہے۔

---

(۱۷۷)

یہ مستی یعنی انتہائی غفلت نے یہ خیال باطل قائم کر لیا ہے کہ زندگی مسرتوں سے مالا مال ہے۔ زندگی سیکڑوں محفلوں کو تسکین دے رہی ہے لیکن درحقیقت یہ ایک خالی ساغر ہے بہت خوب کہا ہے۔

---

(۱۷۸)

اسد میں اپنے معشوق کے اس لطف خاص پر اپنی جاں قربان کرتا ہوں کہ ہم آغوشی کے وقت اس کا رویاں رویاں میرے دل کا حال پوچھتا ہے۔ عجیب و غریب شعر کہا ہے۔

---

(۱۷۹)

ہر کف خاک بہار کے نو بہ نو جلوؤں کے لیے جگر تشنہ یعنی حد سے زیادہ بے تاب ہو رہا ہے لیکن بہار غنچے کے میکدے میں ابھی تامل میں مست ہے مطلب یہ کہ بہار غنچے کے میکدے میں داد عیش دے رہی ہے اور یہاں خاک کا ہر ذرہ اس کے اشتیاق میں آپے سے باہر ہوا جا رہا ہے۔

---

(۱۸۰)

اسلام اور کفر ایک ہی نشے کا خمار ہیں۔ خواہ تو ہم ہو خواہ یقین یہ دونوں ایک ہی سیدھی لکیر یعنی عقل سلیم کی کجی ظاہر کرتے ہیں۔

---

(۱۸۱)

قبلہ اور بت کا ابرو یہ دونوں سوئے ہوئے شوق کا ایک راستہ ہیں بلکہ کعبہ اور بت کدہ دونوں غفلت کی ایک محمل ہیں مطلب یہ کہ مذہب کی ظاہری باتوں میں پڑکر انسان نفس حقیقت سے محروم ہو جاتا ہے۔

---

(۱۸۲)

آئینہ دل اپنی آب و تاب میں چھپ کر رہ گیا ہے۔ اسے خود اپنی جلوہ سامانیوں ہی سے فرصت نہیں ہے۔ دنیا کے لیے اس کے پاس نہ تمنا ہے نہ تماشا نہ تحیر نہ نگاہ! لاجواب شعر ہے۔

---

(۱۸۳)

یہ دنیا عبرت کا ایک میدان ہے یہاں کیا بہار اور کیا تماشا؟ چنانچہ میری نگاہ تو زندگی کے ماتم میں سیہ پوش ہو چکی ہے اسے ہر منظر تاریک ہی نظر آتا ہے۔

---

(۱۸۴)

میری امید اور ناامیدی کیا؟ سب بے صبری کی علامتیں ہیں۔ اسی طرح تیری نگاہ اور بے نگاہی کیا؟ دونوں ہی جان لینے کے بہانے ہیں۔

---

(۱۸۵)

اے اسد جس طرح کتے کا کاٹا ہوا انسان پانی سے ڈرتا ہے اسی طرح میں

آئینہ سے ڈرتا ہوں کیونکہ مجھے انسانوں نے سخت اذیتیں پہونچائی ہیں۔ اور آئینے میں مجھے اپنی صورت میں انسان ہی دکھائی پڑتا ہے۔ لاجواب شعر ہے مطلب یہ کہ انسانوں سے مجھ کو وہ صدمات پہونچے ہیں کہ میں اب دوسروں سے کیا خود اپنی ذات سے بھی متنفر ہوں کیونکہ میں بھی تو ایک انسان ہی ہوں۔ عموماً کسی انسان کو دوسرے انسان سے اپنی ذات کی بنا پر نفرت ہوتی ہے۔ لیکن یہاں نفرت کی وہ انتہا دکھائی ہے کہ جب دوسروں سے نفرت کی وجہ سے خود اپنی ذات سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔

آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل
قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

غالب پر دوسری معیاری کتابیں
غالبیات
از۔ عبدالقوی دسنوی
قیمت چھ روپیے
مشکلات غالب
از۔ نیاز فتح پوری
قیمت دو روپیہ ۵۰ پیسے
غالب سے معذرت کے ساتھ
از۔ احمد جمال پاشا
قیمت دو روپیہ ۵۰ پیسے
جہان غالب
از۔ کوثر چاند پوری
قیمت پانچ روپیے
غالب نامہ
از۔ شیخ محمد اکرام
قیمت چھ روپیے

نسیم بکڈپو لکھنؤ کی شائع کردہ قابل قدر ادبی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت
انتخاب قصائد اردو	ڈاکٹر ابو محمد سحر	7/-
اردو میں قصیدہ نگاری	"	4/-
مطالعہ امیر	"	8/-
مرزا رسوا حیات و ناول نگاری	ڈاکٹر آدم شیخ	6/-
مکاتیب امیر مینائی	احسن اللہ خاں ثاقب	5/-
جلوہ احسن	کلام احسن مارہروی	2/50
ناول کیا ہے	ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ڈاکٹر احسن فاروقی	3/50
غالب سے معذرت کے ساتھ	احمد جمال پاشا	3/50
مقالات تلہری	اختر علی تلہری	2/50
رہنمائے شاعری اول دوم	مولانا افقر موہانی	-/75
مضامین ہفت رنگ	ڈاکٹر آفتاب اختر	2/50
مراۃ الغیب	دیوان امیر مینائی	4/50
جہان غالب	کوثر چاند پوری	5/-
غالبیات	عبد القوی دسنوی	6/-
آثار غالب	شیخ ایم اکرام	6/-
ایک تھا شاعر	مظفر حنفی	12/-
معرکۂ چکبست و شرر	امیر حسن نورانی	6/75
خیر المجالس	مولانا احمد علی مرحوم	6/-
مشکلات غالب	نیاز فتحپوری	2/50

نگارستان	نیاز فتحپوری	4/-
عرض نغمہ	"	1/25
آفتاب داغ	دیوان داغ دہلوی	2/-
دبستان دبیر	ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی	10/-
داستانے چند	باز چاندپوری	2/-
زبان داغ	داغ دہلوی کے خطوط	3/50
ہندوؤں میں اردو	رفیق مارہروی	7/50
اردو شاعری کی ہندوستانی روح	نرزینہ ثانی	1/50
رزم نامۂ دبیر	سرفراز حسین خبیر	4/50
ادب کا تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر سلام سندیلوی	3/50
ادبی اشارے	"	4/50
اردو رباعیات	"	12/-
اردو شاعری میں منظر نگاری	-	10/-
شاد عظیم آبادی کلام و شرح	مرتبہ نقی احمد ارشاد	8/-
خرمن	کلام شفیق جونپوری	2/-
سفینہ	"	2/-
مخزن الاسرار	کلام حضرت شاہ جی خدانما	3/-
سب رس	مرتبہ شمیم انہونوی	5/50
مضامین فرحت اول	مرزا فرحت اللہ بیگ	3/-
نیرنگ خیال	محمد حسین آزاد	1/12
باقیات غالب	وجاہت علی سندیلوی	3/-

انشائے ماجد (اول)	عبدالماجد دریابادی	5/-
انشائے ماجد (دوم)	"	5/50
سفر حجاز	"	6/-
نشریات ماجد	"	3/50
مضامین شرر	عبدالحلیم شرر	4/50
گزشتہ لکھنؤ	"	5/-
اردو غزل کے پچاس سال	ڈاکٹر عبدالاحد خاں خلیل	7/50
اردو انشائیہ	سید صفی مرتضیٰ	3/50
چند ممتاز شعرا	"	1/50
ہمارے نثر نگار	"	1/50
اصناف ادب کا ارتقا	"	1/50
مناظرہ عالم ارواح	مرتضیٰ حسین مولوی	4/-
دیدۂ بینا	کوثر چاندپوری	4/-
فیض تبر	مسعود حسن رضوی	1/50
اردو نثر میں ادب لطیف	ڈاکٹر عبدالودود	8/-
تلمیحات	محمود نیازی	6/-
پنجاب میں اردو	ڈاکٹر محمود شیرانی	5/-
ہندوستانی لسانیات	محی الدین قادری زور	3/-
دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	15/-
عبدالباری آسی	وصی احمد سندیلوی	2/50
ناول کیا ہے۔	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی۔ ڈاکٹر احسن فاروقی	3/-